بیوی کترا

اولڈ بورین کلب تو ملہار ہل پر واقع ہے لیکن اولڈ یاٹ کلب سمندر کے کنارے کف پریڈ پر واقع ہے دونوں کلبوں میں ایک عجیب قسم کی ساجھے داری ہے جس میں اولڈ یاٹ کلب کی حیثیت ایک جونیئر پارٹنر کی ہے وہ اس طرح کہ اولڈ بوربن کلب کے تمام ممبر یاٹ کلب کے ممبر متصور ہوتے ہیں لیکن اولڈ یاٹ کلب کا ہر ممبر اولڈ بوربن کلب کا ممبر نہیں ہوسکتا اولڈ یاٹ کلب کی شرائط آسان اور لچک دار ہیں وہاں صرف روپیہ دیکھا جاتا ہے خاندانی شرافت وراس قسم کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے وہ لوگ!

کنور بلدیو سنگھ دونوں کلبوں کے ممبر ہیں، مگر وہ اپنا زیادہ وقت اولڈ یاٹ کلب میں گزارتے ہیں کیونکہ انہیں بادبانی کشتیوں کی ریس کا بہت شوق ہے جسے یہ لوگ یاٹنگ یا سیلنگ کہتے ہیں کنور بلدیو سنگھ جب سے رنڈوے ہوئے ہیں ان کے شوق بہت حد تک محدود ہو چکے ہیں اب ان کی دلچسپیاں صرف شراب، عورت اور بادبانی کشتیوں پر ختم ہوجاتی ہیں اس سے پہلے انہیں کرکٹ، شکار اور سنوکر کا بھی چسکا تھا۔ لیکن جب ان کی بیوی مری ہے انہوں نے مرحومہ کی یاد میں کرکٹ شکار اور سنوکر تینوں مشغلے ترک کر دیئے ہیں اور اب صرف شراب، عورت اور بادبانی کشتی پر قناعت کرتے ہیں ان کی بادبانی کشتی کا نام ان کی مرحومہ بیوی کنورانی پر میلا سنگھ کے نام پر پر میلا رکھا گیا ہے شرابوں میں وہ صرف بلیک ڈاگ چکھتے ہیں اور عورتوں میں صرف دوسرے کی بیوی پسند فرماتے ہیں کنور بلدیو سنگھ کے بارے

میں مشہور ہے کہ انہوں نے کلب کی پچیس سالہ ممبری میں آج تک کسی کنواری لڑکی پر بری نظر نہیں ڈالی۔ ایسے وضعدار فرشتہ سیرت، پرانی قدروں پر جان چھڑکنے والے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔

جس طرح کچھ لوگ ہمارے سماج میں دوسرے کی جیب کترنے میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے پیشے کی مناسبت سے جیب کترا کہلاتے ہیں اسی طرح کنور بلدیو سنگھ کو دوسرے کی بیوی کترنے میں ملکہ حاصل ہے اور وہ یار لوگوں میں بیوی کترا کے نام سے مشہور ہیں گو یہ ان کا پیشہ نہیں ایک شغل ہے جسے کبھی کبھی محض اپنے شوق کی خاطر اور کبھی کبھی اپنے دوستوں اور مصاحبوں کی دل بستگی کے لیے اختیار فرماتے ہیں، موخر الذکر سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کلب میں کوئی نئی چاند سی صورت دکھائی دے اور یار لوگ اسے پھانسنے کے لیے اپنی کری کر کے ہار جائیں اس وقت تک کنور بلدیو سنگھ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے۔

کبھی معاشقے میں پہل نہیں کرتے بلکہ انتہائی فراخ دلی اور سیر چشمی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے احباب کو اس امر کا موقع دیتے ہیں کہ وہ جی بھر کے لذت کام و دہن کی آزمائش کر لیں انہیں معلوم ہے کہ معاملہ اگر سنگین ہوا اور عورت کسی طرح پھسلنے پر آمادہ نہ ہوئی تو احباب کو ہار مان کر کنور بلدیو سنگھ کے ہی سپرد معاملہ کرنا پڑے گا جسے وہ چند روز ہی میں بلکہ اکثر ایک روز ہی میں بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا لیں گے یہ بات خود انہیں معلوم ہے کہ ان کے احباب کو بھی معلوم ہے۔

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ کلب میں صرف اوباش عورتیں ہی آتی ہیں۔ کلب میں طرح طرح کی عورتیں آتی ہیں ایسی عورتیں بھی جو کنواریاں ہوتی ہیں اور جن کے

اردگرد ہمیشہ ان کے خاندان کی کوئی نہ کوئی شریف عورت منڈلاتی رہتی ہے ایسی عورتوں کو کلب کی اصطلاح میں کچی کلیاں کہا جاتا ہے اور انہیں شجر ممنوعہ کی طرح بخش دیا جاتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ پھر کچھ عورتیں جو پیشہ ورانہ کنواریاں ہوتی ہیں اور تیس چالیس برس کی عمر تک دو درجن معاشقوں کے بعد بھی کنواریاں کہلاتی ہیں اکثر کلبوں کی رونق انہی عورتوں کے وجود سے ہوتی ہے پھر بہت سی عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں ایسی جو واقعی شریف، شادی شدہ، وفا شعار اور شوہر پرست ہوتی ہیں ایسی عورتوں کو بہن جی، بھابی جی، موسی جی اور چچی جان کہہ کر برداشت کرلیا جاتا ہے۔ پھر کچھ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ''نئے چہرے'' کہلاتی ہیں، کلب کے بیشتر ممبروں کی توجہ بھی ان کی طرف مبذول رہتی ہے۔ جونہی کوئی نیا چہرہ آیا اور یاروں نے پانسہ پھینکا، کبھی کبھی ایک مچھلی پر دو چار ماہی گیر اکٹھے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شکاری عمدہ سے عمدہ جال لے کر آتے ہیں نئے سے نیا لاسہ لگایا جاتا ہے اگر چڑیا پھنس گئی تو سبحان تیری قدرت اور نہ لون تیل ادرک، پھر اس نئے چہرے کو یار لوگ یوں ترک کر دیتے ہیں، جیسے شکاری گندی مچھلی کو ٹٹول کر واپس پانی میں پھینک دیتے ہیں اور اپنے پرانے جانے پہچانے چہروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

کلب میں گزشتہ پندرہ روز سے ایک نئے چہرے کے چرچے تھے، مسز بیلا رائے چودھری اپنے خاوند پروفیل رائے چودھری کے ہمراہ لندن جانے والی تھیں جہاز میں سیٹیں بک ہو چکی تھیں جب کمپنی کے دہلی ہیڈ کوارٹر سے مسٹر چودھری کو یکا یک پندرہ دن کے لیے بلوا لیا گیا پروفیل اپنی حسین بیوی کو فلیگ ہوٹل میں

چھوڑ کر دہلی چلا گیا سکیم یہ تھی کہ پندرہ دن کے بعد ہی فوراً ان دونوں کو پھر بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہونا پڑے گا لہٰذا پروفیل بیلا کو فلیگ ہوٹل میں چھوڑ کر اسے اپنے دوست اور لکھ پتی بزنس مین کھیم جی کلیان جی کی نگرانی میں چھوڑ کر بمبئی سے دہلی چلا گیا۔

کھیم جی کلیان جی سکریپ آئرن یعنی ٹوٹے پھوٹے لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کاٹن گرین کے علاقے میں ان کے گوڈاؤن تھے۔اس کے علاوہ ان کا دل اور چہرہ بھی زنگ آلود لوہے کی طرح سخت اور بے رس تھا۔ پھر انہیں بیس سال سے دمہ، ذیابیطس اور گنٹھیا کے مرض تھے اور یہ تینوں مرض اس قدر توجہ طلب کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسرے مرض کا پالنا بہت مشکل ہے کیونکہ کلب کے کچھ ممبروں کے خیال میں عورت بھی ایک مرض ہے جو صرف مردوں کو ہوتا ہے۔

اس لیے کھیم جی کلیان جی نے کچھ رفع شر کی خاطر کچھ اپنے دوست چودھری کی خوشنودی، کچھ کلب کے ممبروں کے کلیان کی خاطر مسز بیلا رائے چودھری کو کلب میں آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مسز چودھری اپنی دلبر اداؤں کی وجہ سے بہت جلد کلب کے شوقین مزاج ممبروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

بیلا ایک سروقد گیسو بریدہ موہنی مسکراہٹ والی حسینہ تھی، بنگال کا جادو یوں بھی مشہور رہے بیلا کی آواز اتنی میٹھی تھی کہ اس کے گلے پر شہد کے چھتے کا گمان ہوتا ہے جب وہ چلتی تھی تو دیکھنے والوں کے دل ٹوٹتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عورت نہیں چل رہی راج ہنس اپنی لانبی گردن نیوڑائے کسی جھیل کی سطح پر تیر رہی ہے جب وہ گاتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گلے سے آواز نہیں پگھلی ہوئی چاندی

بہہ رہی ہے جب وہ اپنا نچلا ہونٹ ذرا سا دبا کر مسکراتی تھی تو دیکھنے والوں کے دل میں گلاب کے پھول کھل جاتے تھے اور بنگال کی آنکھوں کی سیاہ مسحور کن اداسی تو مشہور ہے پہلے ہی دن گھائل ہونے والے اس کے نام پر آہیں بھرنے لگے۔

بیلا رائے کو کلب کا ماحول بہت پسند آیا، بیشتر مردوں کی توجہ پر برا ماننے کی بجائے وہ دل میں کھل اٹھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پروفیل رائے چودھری ایک انگریزی صابن بنانے والی کمپنی میں سیلز مینجر تھا اس بے چارے کو اپنے کام کے سلسلے میں اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں بیلا اپنی تنہائی اور اس کے سونے پن کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی پھر جب کبھی پروفیل اپنے دورے سے واپس آتا تو زیادہ تر صابن کے بارے میں ہی باتیں کرتا کیونکہ اس کا پیشہ ہی صابن بیچنا تھا، اس کا اگر بس چلتا تو نہ صرف صابن کے بارے میں ہی باتیں کرتا بلکہ لوگوں کو صابن کھلا دیتا۔ بیلا ایک خوش مذاق اور پڑھی لکھی، ادب شاعری اور رقص کی دلدادہ عورت تھی اور پروفیل کو کلب لائف سے نفرت تھی اور وہ اپنی بیوی سے شدید محبت کرتا تھا، اور ایک شدید محبت کرنے والے شوہر کی طرح اپنی بیوی کے حسن و جمال کا حاسد تھا۔ اور جہاں تک ہو سکتا تھا، اپنی بیوی کو دوسروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا اس لیے بیلا شادی شدہ زندگی سے مطمئن نہ تھی مگر چونکہ ایک وفا شعار سیدھی سادی عورت تھی اس لیے اپنے دل کے جذبات کو دبا کر جس طرح بھی ہو سکا اب اپنی روکھی پھیکی زندگی پر قناعت کرتی رہی۔ اس کا دل ایک شوخ و شنگ تتلی کی طرح گھومنے کو بہت چاہتا تھا کاش دن رات اس کا خاوند بھی چھیلا بانکا، ہنگامی زندگی بسر کرنے والا ہوتا۔ مگر وہ تو دن رات

صابن کے سوا اور کوئی بات نہ کرتا تھا۔ صابن کی تعریف سن کر بیلا کے دل میں دنیا بھر کے صابنوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی لندن جانے کی بھی اسے خواہش نہ تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ لندن میں اس کا خاوند دن رات صابن کی فیکٹری میں گھسا رہے گا جہاں وہ مزید ٹریننگ کے لیے کمپنی کی طرف بھیجا جا رہا ہے اور وہ دن بھر ایک ٹھنڈے بر فیلے فلیٹ میں ایک اجنبی ماحول میں سڑا کرے گی۔

مگر اس کلب کا ماحول کس قدر روشن اور کھلا ہوا تھا۔ مردوں کے تعریفی فقرے کتنے خوبصورت تھے ان جملوں سے گویا گلاب اور جوہی کی مہک آتی تھی، مارٹینی کی پہلی کاک ٹیل میں کیسی تازگی تھی۔ جیسے برسات کی پہلی پھوار ہوتی ہے والز کے پہلے رقص میں کتنا سبک پن تھا، جیسے وہ ہوا میں اڑنے والی تتلی ہو، ایسی زندگی تو وہ چاہتی تھی؟ اور جانے کیوں کر وہ قید تنہائی کاٹتی چلی آئی تھی اپنی بے مزہ جوانی کی لٹتے ہوئے ایام کو یاد کر کے اس کے دل میں اپنے شوہر کے لیے نفرت کا جذبہ ابھرنے لگا۔

مگر آج تک اس نے کوئی ٹھوکر نہ کھائی تھی اس لیے آخری قدم اٹھانے سے پہلے ہمیشہ گھبرا جاتی۔ پہلے پیگ کے بعد دوسرا پیگ لینے سے انکار کر دیتی۔ کسی مرد کی بے حد بیبا کی سے ڈر کر کترا جاتی اور وہاں سے اٹھ جاتی رقص کرنے کے بعد جب کسی کے ساتھ اکیلے ڈرائیو پر جانے کا سوال پیدا ہوتا تو جھجک کر پریشان ہو کر ٹال دیتی۔ وہ آگ تاپنا چاہتی تھی، مگر آگ کی حدت سے ڈرتی تھی اس نے چار پانچ دنوں کی کاوشوں کے بعد بہت سے مردوں نے اپنی ہار مان لی، کلب کے اراکین اپنے بزنس کی طرح محبت میں بھی فوری منافع کی توقع کرتے ہیں یہ لوگ

انتہائی مصروف ہوتے ہیں ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ پوری زندگی ایک عورت کے عشق میں بسر کر دیں۔ کلب کی تن آسان زندگی میں اگر ایک عورت دو چار روز میں ہاتھ نہیں آتی تو پھر اس کا پیچھا کرنا بے کار ہے۔ لہٰذا یاروں نے ہاتھ کھینچ لیا اور معاملے کو کنور بلدیو سنگھ کے سپرد کر دیا اور پھر دور ہی دور سے اپنی وہسکی کا جام اٹھائے پرانے کھلاڑی کے کھیل کو دیکھنے لگے۔ جب احباب نے کنور صاحب سے شکایت کی کہ ہم سے نہیں ہوتا استاد بڑی حرافہ ہے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی یوں کیسی شگفتہ باتیں کرتی ہے بڑی چار سو بیس ہے اس قسم کی شکایتیں، کنور بلدیو سنگھ مسکرائے وہ ایک عرصے سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے سب سے آخر میں چال چلنے میں یہ خوبی تھی کہ کنور بلدیو سنگھ دوسروں کو آزمائے ہوئے تمام داؤ دیکھ لیتے تھے۔ اس عرصے میں شکار کی خصوصیت اور اس کی تمام خامیوں اور کمزور پہلوؤں سے نفسیاتی طور پر آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کی شخصیت کے حسن و قبح پر غور کرنے کا وقت بھی انہیں مل جاتا تھا۔

پورا قصہ سننے کے بعد کنور بلدیو سنگھ بولے یارو اب تم ہٹ جاؤ اور اپنا کھیل دیکھو! ہرے، بے سے دوست اک دم چلا اٹھے، پھر سب کا (Best of Luck) کہہ کر اپنی وہسکی کے جام خالی کر دیئے۔

(2)

دوسرے دن یاروں نے دیکھا کہ مشرقی لاؤنج کے ایک کونے میں بیلا اور کنور جی بیٹھے ہوئے ہیں اور بیلا انہیں گیتا نجلی پڑھ کر سنا رہی ہے شعروں کا مطلب سمجھا رہی ہے کنور بلدیو سنگھ آج صبح کہیں سے گیتا نجلی کا نسخہ اٹھا لائے تھے انہوں نے

اپنے عشق کی شروعات نہایت عمدہ طریقے سے کی تھی یعنی رابندر ناتھ ٹیگور سے ایک بنگالی کے دل کو گرفت میں لانے کے لیے پہلا قدم یہی ہے۔

گرودیو! گرودیو! کنور صاحب نے شردھا بھری آواز میں کہا ”گرودیو کی کوتا پر میری جان جاتی ہے بیلا جی ان کی شاعری کیسی سبک اور نازک اندام ہے جیسے میری بادبانی کشتی سمندر میں تیرتی ہے ایسے ہی گرودیو اپنی شاعری کی کشتی میں بیٹھ کر انسانی جذبات کی لہروں پر مچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گرودیو اس دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں“ بیلا بے حد خوش ہوئی مگر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی ”نہیں اب ایسا بھی نہیں ہے دنیا میں اور بھی بڑے شاعر ہو گزرے ہیں۔“

جی نہیں کنور بلدیو سنگھ نے کامل قطعیت سے کہا گرودیو کا جواب نہیں، اس دنیا میں افسوس یہی ہے کہ میں نے گرودیو کو صرف انگریزی میں پڑھا ہے، سنا ہے، بنگلہ میں ان کوتاؤں کا مزا ہی کچھ اور ہے۔

بیلا بے حد خوش ہو کر بولی ”سنیے یہی کوتائیں، آپ کو بنگلہ میں سناتی ہوں“

”جی نہیں ایسے کام نہیں چلے گا، گا کر سنایئے“

پہلے تو بیلا نے انکار کر دیا، پھر کچھ اصرار کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ لاؤنج کے کونے میں بیٹھی ہوئی بیلا گا رہی ہے اور کنور بلدیو سنگھ آنکھیں بند کیے جھوم رہے ہیں۔

جب گیت ختم ہو گیا، کافی دیر کے بعد بلدیو سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔۔۔ ”گرودیو کا نغمہ اور آپ کی آواز، مجھے ایسا معلوم

ہوا جیسے میں شانتی نکتین پہنچ گیا۔ جیسے میں ردی ٹھاکر کے چرنوں میں ہوں وہ خاموش، متین سنجیدہ چہرہ، وہ کھلا آسمان اور ناریل کے سندر جھنڈ اس پر یہ زبان! صاحب میری تو یوپی والوں سے لڑائی ہو جاتی ہے وہ اپنی زبان کی بے حد تعریف کرتے ہیں مگر نہیں صاحب بنگلہ کے شائستہ اور میٹھے لہجے کو کون پہنچ سکتا ہے جس میں آپ کی آواز شہد گھول دیتی ہے۔ بیلا کا چہرہ مسرت سے کانوں تک سرخ ہو گیا وہ کچھ نہ بول سکی کنور بلدیو سنگھ نے ایک گہرے اعتماد اور ان جانے انداز میں بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے'' کیا آپ مجھے بنگلہ سکھا دیں گی؟

''میں یہاں چند روز ہوں، بس آٹھ دس روز سے زیادہ تو نہیں رہوں گی''

''بہت وقت ہے آدمی کے دل میں اگر سیکھنے کی تمنا ہو اور آپ ایسی عورت سکھانے کو ملے تو سیکھنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ میری مرحوم بیوی پرمیلا کو بنگالی زبان سے عشق تھا''

''آپ کی؟ آپ کی بیوی مر چکی ہیں؟'' بیلا نے پوچھا

''جی آٹھ سال ہو گئے ہیں''

''اور آٹھ سال تک میرا مطلب ہے اب تک آپ نے دوبارہ شادی نہیں کی، کوئی اپنے مطلب کی عورت نہیں ملی'' کنور جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور پھر اپنی آنکھیں جھکا دیں۔

نہ جانے کیوں بیلا اک دم آبدیدہ ہو گئی۔ کنور جی کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ پر تھا مگر اپنا ہاتھ ہٹانے کو بیلا جی نہ چاہا، بے چارہ! بیلا نے اپنے دل میں کہا، اوپر سے کس قدر کھلنڈرا لگتا تھا ہر وقت سیلنگ کرتا ہوا یا شراب پیتا ہوا، مگر اندر سے

یہ کتنا معصوم اور مظلوم ہے۔

اس کے بعد دو دن یاروں نے دیکھا کہ کنور بلد یو سنگھ انتہائی سعادت مندی سے شاگرد بنے ہوئے بیلا سے کلب میں بنگلہ زبان سیکھ رہے ہیں دونوں صبح صبح ہی کلب میں آ جاتے ہیں۔ ایک ہوٹل سے دوسرا اپنے گھر سے اور شام کو ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ کنور بلدیو سنگھ نے کبھی بیلا کو اکیلے سیر پر جانے یا ڈرائیو کرنے کی دعوت نہیں دی کبھی کوئی فحش مذاق نہیں کیا، ایک رقص کے بعد کبھی دوسرے رقص کی فرمائش اس سے نہیں کی، انتہائی سلیقہ مندی سے چلتے رہے تھے۔

''بہت سلو جا رہا ہے میرا یار! پرنس فیروز نے جو خود اس لائن میں ایک استاد کا درجہ رکھتے تھے پسی نام کے ایک لکھ پتی نوجوان سے کہا''

''کنور کی ایک تکنیک ہے پرنس! سپی اپنی سنہری پیٹی کستے ہوئے بولا اور اس کا نشانہ کبھر خطا نہیں جاتا ہے اور ابھی تو اس نے اپنا ہنٹنگ کوٹ نہیں نکالا ہے۔''

کلب میں کنور بلدیو سنگھ کا شکاری کوٹ بہت مشہور تھا یہ آدھا اسکاٹ لینڈ کی اون کا اور آدھا چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ اور اس کی باہر کی دونوں جیبیں، تھیلوں پر بھی بھورا چمڑا لگا ہوا تھا۔ یہ کوٹ صرف دو موقعوں پر نکالا جاتا تھا۔ ایک تو بادبانی کشتیوں کی بڑی ریس کے موقعے پر، دوسرے اس وقت جب کنور جی کسی عورت پر اپنا داؤ آزمانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ یہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر کنور بلدیو سنگھ کلب میں آتے تھے۔ اس دن یار لوگ سمجھ جاتے تھے کہ آج حریف کی خیر نہیں، چاہے وہ کوئی عورت ہو یا ریس میں کوئی ان کا مخالف ہو۔

چنانچہ پرنس فیروز اور پسی کی اس گفتگو کے دوسرے دن ہی جب کنور صاحب

اپنا ہنٹنگ کوٹ پہن کر کلب میں داخل ہوئے تو دبی دبی زبان میں چاروں طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔

آج اعلان جنگ ہے!

فائنل میچ ہے!

بے چاری!

رضیہ عطا اللہ جو اس کلب میں نئی نئی آئی تھی اور جس نے لکھنو میں اپنے حسن و جمال کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے تنک کر اپنی سہیلی مسز رضا علی سے پوچھا

''یہ کون آدمی ہے؟ اس نے کیسا جنگلیوں کا سا لباس پہن رکھا ہے''

یہ کنور بلدیو سنگھ ہے بڑا اچھیلا سمجھا جاتا ہے ہٹو! رضیہ عطا اللہ بے زار ہو کر بولی'' بالکل بن مانس معلوم ہوتا ہے''

ٹکا پرمل کمار نے اپنے دوست گردھاری لال سے سرگوشی میں کہا'' گردھاری لال اس کم بخت کے ہنٹنگ کوٹ میں کیا رکھا ہے؟ جس دن کنور یہ کوٹ پہنتا ہے عورت کی ساری مخالفت ختم کر دیتا ہے۔''

یہ سب باتیں یاٹ کلب کے برآمدے میں ہو رہی تھیں جس کے زینے کف پریڈ سے سمندر تک جاتے تھے۔ جہاں پانٹوں برج سے لگے ہوئے کلب کے یاٹ کھڑے تھے آج سیلنگ کرنے کے لیے کنور یہ کوٹ پہن کر آیا تھا اور اس نے پہلی بار بیلا کو سمندر میں سیلنگ کی دعوت دی تھی اور اس نے پہلی بار اپنا کریو بنایا تھا ساڑھے چار میل کی ریس میں اس کی کشتی کے علاوہ چھ اور کشتیاں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ بیلا کا سکپر (Skipper) کنور بلدیو سنگھ تھا اور وہ ریس کرنے میں

مشاق مانا جاتا تھا اس کا کریو (Cerw) بننے میں بیلا نے کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کی تھی اوپن ریس تھی چھ دوسری کشتیاں بھی ہونگی ان کے سکپر (Skipper) اور کریو (Crew) بھی ہوں گے، کسی قسم کا ڈر نہ تھا اور پھر کنور سے ڈر کیسا۔ ان چار دنوں میں بیلا کنور کے اس قدر قریب آ گئی تھی اور دل ہی دل میں اسے پسند کرنے لگی تھی۔ کسی طرح کنور اس کی معمولی سی معمولی بات میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور اس کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے تیار ہو جاتا تھا کس قدر مہذب اور سلیقہ مند انسان تھا اگر اس کی شادی اس صابن بیچنے والے خشک اور بے رس آدمی کی بجائے اس شگفتہ مزاج ہمدرد انسان سے ہوئی ہوتی؟

کئی بار بیلا کے دل میں خیال آیا تھا، کئی بار اس خیال کو اس نے اپنے دل میں دبا دیا تھا

3

پانٹوں برج کراس کر کے جب وہ دونوں کشتی میں بیٹھنے لگے تو بیلا چونک کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا کہ کشتی پر کا نام بدل دیا گیا ہے جہاں ''پرمیلا'' تھا، وہاں سفید حرفوں میں ''بیلا'' لکھا ہے۔

یہ کیا، بیلا نے کانوں تک سرخ ہوتے ہوئے پوچھا

''کچھ نہیں! کنور بلدیو سنگھ نے سنجیدگی سے کہا''

''یہ بھی ایک نام ہے''

بیلا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی، مگر کچھ کہہ نہ سکی، کشتی میں بیٹھ گئی کنور اسے بادبانی کشتی کے حصے اور ان کے نام سمجھانے لگا

''دیکھو یہ ماسٹ بوم ہے یہ جب بوم ہے ماسٹ بوم کشتی کا سب سے بڑا بادبان ہے، یہ دوسرا چھوٹا بادبان جب بادبان کہلاتا ہے یہ ماسٹ کے نیچے سنٹر بوٹ ہے یہ دومن وزنی لوہے کا ہے۔''

''یہ رڈ اور ٹلر ہے(Rudder Tiller) اس سے کیا کرتے ہیں'' بیلا پوچھنے لگی

''اس سے کشتی کا رخ بدلتے ہیں اگر اسے دائیں طرف گھمائیں تو کشتی دائیں طرف گھومے گی، یعنی عورت کی طرح جس طرح گھومنے کو کہو! اس سے الٹ گھومے گی، بیلا زور سے ہنسی واہ بھی عورتیں کیا ایسی ہوتی ہیں بہت شریر ہیں آپ!''

''کشتی کے بائیں طرف کو سٹاربورڈ کہا جاتا ہے اور دائیں طرف کو پورٹ!''

''تیسرے بادبان کو توازن میں رکھنے کے لیے دوسٹیز!(Stays) ہیں یہ بگ سٹے ہے(Big Stay) اور دوسرا فورسٹے(Fore Stay) کہلاتا ہے۔''

''یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' ''تم'' مجھے یہ بتاؤ میرا کام کیا ہوگا اس کشتی میں!

بیلا نے پہلی بار کنور کو ''تم'' کہہ دیا اور تم کہنے کے بعد وہ خود بخود چونک گئی۔ مگر خیریت گزری کہ کنور نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا وہ اس وقت جب شیٹ کی دونوں رسیاں دیکھ رہا تھا وہ بیلا کی طرف مڑے بغیر بولا۔

''میرا کام ہے بڑے بادبان کو سنبھالنا، تمہارا کام ہے جب بادبان کو دیکھنا

اور سنٹر بوٹ کو سنبھالنا'' کنور بیلا کو سمجھانے لگا اور سمجھانے کے لیے اسے بیلا کے بہت قریب آنا پڑا، دیکھو اس رسے کو بوم ٹک (Boom Tuck) کہتے ہیں اور اس رسے کو کنٹرول کرنے کے لیے سنٹر بوٹ کو نیچے اوپر کیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ یہ لوہے کا تار ہے یہ ایک پلی سے اسے یوں گھماؤ یوں کھینچو۔

کبھی بیلا کے ہاتھ کنور کے ہاتھ سے ٹکرا جاتے کبھی وہ اس کے بازو اپنے بازو میں لے کر رسی کھینچنے کے گر بتاتا۔ کبھی ایک کی سانس دوسرے کی سانس میں گھل جاتی ''بہر حال تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا کنور نے بتایا اور پھر اپنا ہنٹنگ کوٹ اتار کر بیلا کو تھما کر دیا اوہ گرمی لگ رہی ہے خواہ مخواہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر آ گیا۔ تم سے اگر اور کچھ نہیں ہوتا تو میرا یہ کوٹ تو اپنے پاس رکھو۔''

اتنے میں ریس شروع ہو گئی! شروع میں بیلا نے بہت غلطیاں کیں۔ کیونکہ وہ ایک ہاتھ میں کنور کا ہنٹنگ کوٹ تھامے ہوئی تھی صرف ایک ہاتھ سے کتنا کام ہوتا ہے کنور نے اسے ایک بار ڈانٹ بھی دیا۔

''مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا! میں تمہارا کوٹ سنبھالوں اور جب سیل بھی دیکھوں!'' بیلا نے تقریباً آبدیدہ ہو کر کہا

''لعنت بھیجو! کوٹ پر اسے نیچے کشتی میں گرا دو یا پانی میں پھینک دو! کنور نے بڑی لاپروائی سے کہا، کوٹ کی پروا مت کرو سیل کو دیکھو، ریس ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔''

اگلے پندرہ بیس منٹ بیلا کنور کے احکام کے مطابق کام کرتی رہی لیکن جب اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے آ گئے اور اس کے دونوں ہاتھ رسیوں کی گرفت

سے زخمی ہو گئے۔تو کنور نے اسے ایک کونے میں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور سب کام خود کرنے لگا۔ کریو کا بھی سکپر کا بھی، بیلا شرمندہ ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کشتی کے اندر گرا ہوا ہنٹنگ کوٹ اٹھایا اور اپنے گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گئی۔

عین اسی وقت ہنٹنگ کوٹ اٹھاتے وقت اس نے دیکھا کہ کوٹ کی باہر کی جیبوں میں دونوں جیبوں میں سو سو کے بے شمار نوٹ بھرے ہوئے ہیں چند لمحوں تک کو بیلا سناٹے میں آ گئی، اس نے کنور کی طرف دیکھا اگر کنور پسینے میں تر بتر سیلنگ کے جانکاہ کام میں مصروف تھا۔ بیلا نے کنور کی طرف سے نگاہیں ہٹا لیں اور ذرا رخ موڑ کر چوری چوری نوٹ گننے کی کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے نوٹوں کو گننا چھوڑ دیا مگر اسے اندازہ ہو گیا کہ کم سے کم پچاس ہزار کے نوٹ ضرور ہوں گے۔

کچھ دیر کے بعد بیلا نے مسکرا کر کہا، اگر میں تمہارا کوٹ پانی میں پھینک دوں تو!

''پھینک دو! کنور نے انتہائی لاپروائی سے کہا، مگر اس وقت مجھے بور مت کرو''

'' جانتے ہو تمہارے کوٹ میں اس وقت پچاس ہزار روپے پڑے ہوئے ہیں'' بیلا نے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا

ارے! کنور نے یکا یک اپنی غلطی پر پشیمان ہوتے ہوئے کہا'' میں نے پرسوں دوسرے کوٹ سے نکال کر روپے اس کوٹ میں رکھ دیئے تھے پھر اپنی تجوری میں رکھنا یاد نہیں رہا آج جلدی میں یہی کوٹ پہن کر چلا آیا۔''

''پچاس ہزار روپیہ رکھ کر بھول جاتے ہو کیا تمہاری دیکھ بھال کرنے والا کوئی

نہیں ہے'' بیلا نے اسے ذرا ہمدردی سے دھمکاتے ہوئے کہا'' آپ میری کوئی بیوی تو ہے نہیں'' کنور ذرا تلخی سے بولا، اور جس عورت کو میں بھی پسند کرتا ہوں وہ کسی دوسرے کی شادی شدہ نکلتی ہے اتنا کہہ کر کنور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے کچھ کہا بھی نہ تھا مگر بیلا کا دل ہولے ہولے اندر ہی اندر پگھلنے لگا ایک وہ صابن بیچنے والا ہے جو پیسے پیسے کا حساب مجھ سے لیتا ہے، ایک یہ فراخ دل انسان ہے جو میری اک نگاہ پر پچاس ہزار روپے پانی میں غرق کرنے کی توفیق رکھتا ہے۔ جو مجھے دل و جان سے چاہتا ہے روپے؟ روپے کی تو اسے اتنی پرواہی نہیں اسے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ کونسی جیب میں کتنے روپے رکھے ہیں ایک وہ ہے صابن کی ایک ٹکیا تک گن لیتا ہے حالانکہ کمپنی سے مفت آتی ہیں۔

بیلا نے بہت دیر کے بعد رک رک کر گھٹے ہوئے لہجے میں کہا'' تم چاہو تو میں تمہارے لیے ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں''

کیسے اس کے منہ سے نکل گیا، کیوں کر اتنی بڑی بات اس نے کہہ دی کہ وہ کانپ گئی اور شرم سے لال ہو کر نوٹوں والے کوٹ پر دوہری ہو گئی

''پھر بات کریں گے'' کنور نے لاپروائی سے کہا

''اس وقت ریس نکلی جا رہی ہے''

ہولے ہولے بیلا نوٹوں والے کوٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی اسے اس کوٹ پر بڑا پیار آنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے ہمیشہ سے یہ کوٹ اس کا تھا ہمیشہ سے صرف اسی کا حق تھا۔

کنور بلدیو سنگھ نے بڑی پھرتی سے جب ہیلٹ سے چھوٹے بادبان کو اونچا کیا اور پھر عقابی نگاہ سے آگے دیکھتے ہوئے بادبانی کشتی کو ریس میں سب سے آگے لے جاتے ہوئے زور سے کہا۔

''وہ مارا!''

4

کنور اور بیلا ریس جیت گئے تھے بیلا کو جب کپ ملا تو سارے کلب کے ممبروں نے بڑے زور شور سے تالیاں بجائیں پھر کنور اور بیلا کی اکٹھے تصویر لی گئی، پھر ان دونوں کا جام صحت پیا گیا، پھر بڑی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں اور ایک دوسرے کے جام صحت پیے جاتے رہے۔

چلتے وقت کنور نے بیلا سے پوچھا

''آج شام کو کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں''

''میں آؤں گا'' کنور نے بڑے اطمینان سے اپنا ہنٹنگ کوٹ پہنتے کہا ''کہیں گھومنے چلیں گے، اکٹھے کھانا کھائیں گے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کنور وہاں سے چلا گیا۔ بیلا لاؤنج کے ایک کونے میں اکیلی کھڑی خوف اور مسرت کے ملے جلے احساس سے کانپنے لگی۔''

5

اگلے تین چار دن ان دونوں کے ایسی سنہری دھوپ میں گزرے جہاں بادلوں کا سایہ نہ تھا۔ ایک دھیمی دھیمی جھلملاتی ہوئی خوشگوار روشنی چاروں طرف چھائی

ہوئی تھی ۔سمندر کا پانی نغمے سنا رہا تھا اور ہوا میں ابابیلیں اڑتی تھی ۔

پھر پروفیل رائے چودھری آ گیا اور یکا یک کنور ایسا ہو گیا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا، بیلا دھک سے رہ گئی وہ چھپ چھپ کر کنور کے قریب جاتی، مگر کنور وہاں سے ٹل جاتا وہ اسے بلانے کے لیے وز دیدہ نگاہوں سے تاکتی، اور کنور یوں دیکھتا جیسے وہ آنکھوں سے اندھا تھا اور کانوں سے بہرہ تھا اور اپنے سینے میں دل کی بجائے صرف ایک ہنٹنگ کوٹ رکھتا تھا۔

دوسرے دن بیلا کی روتی ہوئی سوجی آنکھوں کو دیکھ کر لالہ گردھاری لال نے آہستہ سے کنور سے پوچھا یار ہمیں بھی بتاؤ تمہارے کوٹ میں کیا ہے؟ کوئی گیڈر سنگھی ہے یا کوئی تعویذ ہے۔

کنور بلدیو سنگھ نے مسکرا کر کہا ’’لالہ اس کوٹ میں موجودہ زمانے کا سب سے بڑا تعویذ ہے۔‘‘ پھر کنور بلدیو سنگھ لالہ کے پاس سے اٹھا اور رضیہ عطاء اللہ کے پاس جا بیٹھا اور تھوڑی دیر کے بعد یاروں نے سنا کہ ان دونوں میں بڑے زور کی بحث چل رہی ہے اور کنور بلدیو سنگھ میز پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا ہے۔

’’اجی چھوڑو! ٹیگور کو ٹیگور بھی کوئی شاعر ہے؟ مس رضیہ سلطانہ عطاء اللہ میں آپ سے کہتا ہوں، اس دنیا میں صرف ایک شاعر ہے اور کنور بلدیو سنگھ صرف ایک شاعر کا قائل ہے اور وہ شاعر ہے اقبال اقبال کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔‘‘

☆☆☆☆☆

بے داغ فولاد

دادر سے وہ ڈی بس میں سوار ہوا، اور اوپر کی منزل پر جہاں میں بیٹھا تھا ہانپتا ہوا آ کر سیدھا، میرے ساتھ کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے میرے برابر کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی جس نے کولا بے کا ٹکٹ لیا تھا اور جو ایمان کی بات ہے کہ اس قدر حسین تھی کہ اسے دیکھ کر قاعدے سے مجھے کولا بے کا ٹکٹ لے لینا چاہیے تھا مگر اس زندگی کی چلتی ہوئی بس کو کیا کہیے، جس میں یوں تو ہر مسافر میرا ساتھی ہے، محبوب ہے، بھائی ہے، بہن ہے، خاوند ہے، بیوی ہے، ماں ہے، باپ ہے، بیٹا ہے، پھوپھا اور چچا ہے، دوست اور غمگسار ہے، لیکن جہاں ہر شخص کی منزل الگ الگ ہے جہاں ہر شخص باری باری سے بس کے اندر آتا ہے باری سے اپنا ٹکٹ کٹاتا ہے، دو جھٹکے اور بس آگے چل دی اور کوئی نہیں پوچھتا تم کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے، کدھر کو گئے؟ کیا اتنا ہی تمہارا ہمارا ساتھ تھا۔ کیا تمہارے بالوں کی اتنی ہی خوشبو، تمہاری نگاہوں کی اتنی ہی گرمی، تمہارے تبسم کی اتنی ہی ملائمت ہماری تھی دو جھٹکے اور سانس غائب اس لیے میں نے گرانٹ روڈ کا ٹکٹ لیا تھا، بس کنڈکٹر نے جھک کر بڑی خندہ پیشانی سے اسے ٹکٹ دیا تھا، لیکن میری طرف مڑتے ہیں اس کی مسکراہٹ کائی کی طرح پھٹ گئی تھی ''کہاں کا ٹکٹ؟'' اس نے روزمرہ کے تجارتی لہجے میں پوچھا

''گرانٹ روڈ کا''

''نکالو تین آنے''

''لو تین آنے''

کھٹاک سے ٹکٹ حاضر، قصہ ختم، بس کنڈ یکٹر آگے چلا گیا، اس کی پیشانی پر اب وہ نور نہ تھا، جو اس خوبصورت عورت کو دیکھنے سے پیدا ہوا تھا خوبصورتی کا احساس تو جانوروں کو بھی ہوتا ہے۔ اور بس کنڈ یکٹر ہر چند کہ مشین کی طرح کام کرنے پر مجبور تھا، آخر ایک انسان ہے کبھی نہ کبھی اس کے چہرے پر بھی وہ نگاہ کھل اٹھتی ہے جو پھول کی طرح محبت کی خوشبو سے مہکتی ہے بس کنڈ یکٹر نے اچھا ہی کیا جو وہ نگاہ اس نے مجھ پر ضائع نہ کی حالانکہ مجھ سے پہلے اس کی نگاہوں کا شرمیلا لہجہ بڑے مہذب طریقے سے بیان کر رہا تھا'' اے خوبصورت لڑکی، افسوس کہ بس صرف کولا بے تک جاتی تھی، اگر کہیں آگے تک جاتی اور وہاں تک جاتی جہاں تیرا گھر ہے! تو وہیں کا ٹکٹ کاٹ کر دیتا۔ اس بس کی کنڈ یکٹر کی ادا دیکھ کر مجھے زندگی کے سب سے بڑے بس کنڈ یکٹر کا خیال آیا، جو باری باری ہر مسافر کو اس کی منزل پر اتار دیتا ہے اور پھر میں نے سوچا، موت ضرور ایک عورت ہے، موت اگر ایک مرد ہوتی تو کبھی کسی خوبصورت عورت کی جان نہ لیتی۔ صرف ایک عورت ہی رشک و حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کر سکتی ہے۔''

اب یہ تو معلوم نہیں کہ موت مرد ہے یا عورت بہر حال وہ آدمی جو دا ور پر میرے ساتھ آ کر بیٹھا وہ یقیناً مرد تھا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی اس کے بھاری بھر کم جسم کی اوٹ میں وہ لڑکی آ گئی اور میں اس کے بعد اسے دیکھ نہ سکا۔ ہاں اگر میری گردن بہت لمبی ہوتی اور اتنی خم دار ہوتی کہ آگے پیچھے با آسانی گھوم سکتی، تو میں اسے ضرور دیکھ سکتا تھا، ایسے موقعوں پر میرا جی چاہتا ہے کہ میں انسان نہ ہوتا،

سارس ہوتا، کلنگ ہوتا، زراف ہوتا، شتر مرغ ہوتا۔ اگر ہوتا تو کیا ہوتا؟

مگر اس بھاری بھرکم آدمی نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا چند لمحوں کے لیے اس نے بس میں ادھر سے ادھر نگاہ ڈالی اور پھر میری طرف اس طرح دیکھا، جیسے کوئی آدمی تیسری منزل سے نیچے کسی کپڑے کو دیکھے میں چونک کر اپنی کمزور اور منحنی سی گردن کے گرد پھٹے ہوئے کالر اور بوسیدہ ٹائی کو ٹھیک کیا دراصل میں اس قسم کی نگاہ سے بہت بدکتا ہوں۔ اس گرانٹ روڈ کے ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر ہوں، تاریخ، جغرافیہ اور علم نباتات پڑھاتا ہوں، کبھی کبھی سوکس، انگریزی اور حساب بھی پڑھاتا ہوں، تنخواہ پچاسی روپے ہے کورسید ایک سو پینتیس روپے کی کاٹتا ہوں، عرصہ تیس سال سے اسی مدرسے میں اسی تنخواہ پر کام کر رہا ہوں۔

اخلاقاً میرا شمار انسانوں میں ہوتا ہے گو جہاں تک آمدورفت کا تعلق ہے مجھے عالم نباتات میں شامل کر سکتے ہیں اور تنخواہ کے اعتبار سے میرا تعلق عالم جمادات سے ہے۔ کلاس کے اندر طالب علموں کی دھمکیاں سہتا ہوں اور کلاس کے باہر ہیڈ ماسٹر اور مینجر اور بیوی کی گھرکیاں برداشت کرتا ہوں، چونکہ مجھے ہر روز اس قسم کی نگاہ سے واسطہ پڑتا ہے اس لیے اس نگاہ کو میں ہر جگہ پہچان جاتا ہوں اس وقت بھی میں نے اس نگاہ کو فوراً پہچان لیا، جو گویا مجھ سے کہہ رہی ہے اے ذلیل کمینے دبلے پتلے مفلوک الحال انسان، تیری یہ مجال کہ تو اس طرح میرے ساتھ میری سیٹ پر بیٹھے؟

اس نگاہ کے جواب میں میں مسکرا دیا بڑی ہی پھیکی کھسیانی؟ اپنے آپ پر شرمندہ ہوتی ہوئی مسکراہٹ تھی وہ گویا ہاتھ جوڑ کر اس آدمی سے کہہ رہی تھی، جانے

دو بھائی مجھ سے کیوں الجھتے ہو، ایک غریب آدمی ہوں بیٹھا ہوں، بیٹھا رہنے دو، گرانٹ روڈ اتر جاؤں گا، تمہارا کیا لیتا ہوں، اس طرح گھور کر کیوں دیکھتے ہو لو میں اور پرے ہوا جاتا ہوں!

میں کچھ کہا نہیں، لیکن اپنی سیٹ پر سمٹ کر اور سکڑ کر بیٹھ گیا دوسرا آدمی اس اعتبار سے اور پھیل گیا، اس نے اپنے نتھنے پھیلا کر مجھ سے پوچھا ''کیا ٹائم ہے؟''

میں نے بڑے مسکین لہجے میں کہا ''جی میرے پاس گھڑی نہیں ہے'' اور اس آدمی کے لہجے میں نخوت کی مقدار بڑھ گئی، جس طرح ذیابیطس کے مرض میں شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے اس نے ہاتھ کے اشارے سے کنڈیکٹر کو اپنے پاس بلایا اور اس سے وقت پوچھا، کنڈیکٹر نے وقت بتایا تو اس آدمی نے اپنی سونے کی گھڑی سے وقت ملاتے ہوئے کہا

''تمہاری گھڑی غلط ہے''

''ہوگی جناب''

''ہوگی نہیں'' اس آدمی نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا ہے ''تم بس کنڈیکٹر ہو اور ٹھیک ٹائم نہیں رکھتے ہو جبھی تو بسیں لیٹ ہوتی ہیں، یہ بس بھی دادر کے سٹاپ پر پانچ منٹ لیٹ پہنچی ہے تم لوگوں کو مسافروں کا خیال تک نہیں رہتا ہمارا کتنا ہرج ہوتا ہے؟''

''یہ بھی تو خیال کیجئے'' کنڈیکٹر بولا ''آج کل برسات کا زمانہ ہے، دن بھر بارش ہوتی رہتی ہے اگر ہم برابر سپیڈ سے گاڑی چلائیں تو کتنے حادثے ہوا کریں، بھلے ٹائم سے پانچ منٹ بعد پہنچتے ہو، مگر گھر تو پہنچ جاتے ہو سیٹھ صاحب!''

کنڈیکٹر کی اس بات پر کچھ لوگ مسکرائے، میں تو مسکرانے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ کیوں کہ وہ آدمی میرے اس قدر قریب بیٹھا تھا، مگر اس آدمی کی تسلی کنڈیکٹر کا جواب سن کر نہ ہوئی اس نے فوراً سر ہلا کر کہا ''سپیڈ سے کیوں نہیں چلا سکتے، ضرور چلا سکتے تھے، مگر سڑکوں کی حالت دیکھتے ہو؟ بارہ بارہ انچ کے گڑھے، گاڑی کا ایکسل بھی ٹوٹ جائے، اگر تیز چلے، ابھی ادھر ماٹنگا سے دادر آتے آتے میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، سالا، جدھر دیکھو، آج کل بے ایمانی کا راج ہے پہلے سڑک پر کچے کی تہ کے اوپر سیمنٹ کا ردہ جمایا جاتا تھا، اس کے اوپر روڑی اور کولتاری کی کارپٹنگ ہوتی تھی۔ آج کل خالی کچی مٹی کی تہ پر کارپٹنگ ہوتی ہے، چھ مہینے میں سڑک ٹوٹ جاتی ہے ٹھیکے داروں کے مزے ہیں، شریف لوگوں کی گاڑیاں ٹوٹتی ہیں، سالا! ادھر جو ہے چور ہے، بے ایمان ہے، لٹیرا ٹھگ اور دھوکے باز ہے!''

اس کے بعد اس نے زیر لب بہت سی گالیاں سنائیں وہ بہت خفا معلوم ہوتا تھا اس کا چہرہ سانولا اور چیچک زدہ تھا بال سیاہ اور بھوئیں گھنی تھیں، چہرہ بھاری بھاری تھا اور جسم بھی بھاری تھا، اور کمر کے نیچے اس نے ایسی شفاف دھوتی باندھ رکھی تھی کہ اس کی ریچھ کی سی ٹانگوں کا ایک ایک بال نظر آتا تھا کنڈیکٹر نے اس سے پوچھا ''کہاں کا ٹکٹ''

''باہے سینٹرل''

''ڈھائی آنے!''

سیٹھ نے اپنا بڑا بٹوہ کھولا، فراخ کشادہ بٹوہ! اس بٹوہ سے چھوٹا تو میرا گھر

تھا۔ جس میں میری بیوی اور پانچ بچوں اور ایک بوڑھی خالہ سمیت رہتا تھا۔ یہ کتنے ہی تو اس میں کمرے تھے۔ ایک ہزار روپے کے نوٹوں سے بھرا تھا، ایک کمرہ سو روپیوں کے نوٹوں کے لیے تھا، ایک کمرہ دس روپے کے نوٹوں کے لیے ایک کمرہ پانچ روپیوں کے نوٹوں کے لیے ایک کمرے میں ریز گاری تھی، ایک کمرے میں ضروری کاغذات رکھے تھے۔ بٹوے کے بیچ میں ریشم کی ڈوری تھی یہ نوٹوں سے جگمگاتا ہوا بٹوا ایک عالی شان محل کی طرح خوبصورت تھا میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا جیسے میں اس حسین لڑکی کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا، جو اب میری نظروں سے اوجھل تھی، میں دل ہی دل میں حساب کرنے لگا تیس سال میں نے مدرس کا کام کیا۔ سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں تو تیس سال میں تین سو ساٹھ مہینے ہوئے ہر ماہ کی تنخواہ پچاسی روپے ہوئی تو مجھے اب تک کیا ملا، تیس ہزار چھ سو روپے اس سے زیادہ رقم یہ سیٹھ اپنے بٹوے میں دبائے پھرتا ہے، میری پوری زندگی اس بٹوے میں تھی سیٹھ نے اس ریز گاری کے خانے سے ڈھائی آنے نکالے اور کنڈیکٹر کو دے دیئے اور پھر بٹوہ بند کر کے اندر جیب میں رکھ لیا، اور یکا یک میں اپنے آپ کو اس کی جیب کے اندر جاتا محسوس کیا، اور یکا یک میں اس کی نگاہ کا مطلب سمجھ گیا، اوپر کا مطلب نہیں وہ باطن کا گہرا ماتھوں کے اندر رہی اندر سماج کا چھپا ہوا وہ گھناؤنا راز سمجھ گیا، جو یہاں کی ہر کتاب اپنے طالب علم سے اخبار اپنے پڑھنے والے سے ہر حاکم اپنے محکوم سے چھپاتا ہے تم میری جیب میں ہو؟ تم میری جیب میں ہو! بٹوہ اندر کی جیب میں رکھ کے اس آدمی نے پھر چوکنا ہو کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔

''کہاں کام کرتے ہو؟''

''گرانٹ روڈ پر ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر ہوں''

''ٹیچر ہو کر گھڑی نہیں رکھتے ہو، تو وقت پر سکول کیسے جا سکتے ہو۔ وقت پر طالب علموں کو کیسے پڑھا سکتے ہو گے، مگر کس سے کہیں؟'' وہ آدمی بہت برا منہ بنا کر بولا حالانکہ اس کا منہ اس سے پہلے بھی کچھ کم برا نہ تھا۔

''یہاں جو ہے کام چور ہے کوئی کام سے جی چراتا ہے تو کوئی وقت چراتا ہے کسی کو دیش کا خیال نہیں میں نے کمزور لہجے میں کہا'' میں تو وقت ہی سے گھر چلا تھا رستے میں دو بسوں پر باری نہ آئی، تیسری بس ملی، تو بارش ہونے لگی اور ڈرائیور پھسلن سے ڈر کر بس آہستہ چلا رہا تھا۔

''ہے اب کیا کریں؟''

''یہ کریں؟ جرمانہ ہونا چاہیے تم ایسے لوگوں پر جرمانہ اور کیا؟'' مجھے دیکھو، میرا کرلا میں بے داغ فولاد Stainless Steel کا کارخانہ ہے ڈھائی سو مزدور کام کرتے ہیں وہاں، مگر کیا مجال جو وہاں کوئی ایک منٹ بھی لیٹ پہنچے، جرمانہ کر دیتا ہوں، پگار میں سے کاٹ لیتا ہوں، یا اوور ٹائم کرنے کو کہتا ہوں مگر کس سے کہوں؟ وہ تو میرا کارخانہ ہے یہاں کس سے کہوں؟ سیٹھ نے جھنجھلا کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر اسے باہے سینٹرل کی عمارت پر لگے ہوئے بڑے کلاک کی سوئیوں سے صحیح وقت کا اندازہ کیا اور زور سے سانس اندر کھینچ کر چلایا

''میں تو دس منٹ لیٹ ہو گیا اپنی اپوائنٹمنٹ ہے''

''کیا فرق پڑتا ہے؟ میں نے ڈھارس دیتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا''

آپ سیٹھ صاحب ہیں جہاں بھی جائیں گے لوگ آپ کا انتظار کرتے ہوں گے۔

''انتظار میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے مسٹر'' سیٹھ نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے میرے برنس سے ہر منٹ پانچ روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ دس منٹ بے کار گئے تو سمجھے پچاس روپے گئے، وقت روپیہ ہے مسٹر!''

وقت کے متعلق انسان کے مختلف نظریئے ہیں، وقت روپیہ ہوتا ہے، وقت کون ومکاں کی چوتھی حد ہے۔ وقت کائنات کا چوکھٹا ہے وقت شعور کا دھارا ہے جو ماضی حال اور مستقبل کے گرد ایک دائرے کی صورت میں گھوم رہا ہے وقت ایک بوڑھا ہے، جسے صرف اس کے ماتھے کے بالوں سے پکڑا جا سکتا ہے وقت شب انتظار ہے یا وقت وصال کسی کا پہلا بوسہ ہے تو کسی کی آخری ہچکی، کسی کے لیے تخت ہے تو، کسی کے لیے تختہ! مگر یہ تاویلیں غلط ہیں، وقت ایک بٹوہ ہے جس میں ایک مدرس کی تیس سالہ زندگی کے ایام بند ہیں!!

میں نے بڑے حسرت ناک لہجے میں سیٹھ سے پوچھا ''سیٹھ یہ بے داغ فولاد کیا ہوتا ہے جس سے تم فی منٹ پانچ روپے کماتے ہو''

''ٹیچر ہو کر یہ نہیں جانتے؟ ارے تم کیا خاک ٹیچر ہو، کیا پڑھاتے ہوگے۔ تم اپنے طالب علموں کو، ارے بدھو، یہ بے داغ فولاد Stainless Steel ہوتا ہے اسے زنگ نہیں لگ سکتا، اس کے برتن بنائے جاتے ہیں یہ گھڑی جو تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو یہ بھی اسی بے داغ فولاد کی ہے اس کا رنگ بھی خراب نہ ہوگا، اسے مٹی میں ڈال دو، پانی میں پھینک دو، اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوگا''

''کمال ہے بھئی'' میں نے حیرت سے کہا ''تو کیا صرف برتن اور گھڑیاں ہی

بے داغ فولاد سے بنتی ہیں''

''نہیں'' سیٹھ نے میری لاعلمی پر مسکراتے ہوئے کہا، سینکڑوں چیزیں بے داغ فولاد سے بنتی ہیں۔

''تو انسان بھی بنتے ہوں گے'' میں نے پر امید لہجے میں پوچھا

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا

''ایسے انسان جن پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو، بے داغ فولاد کے انسان!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا

میں نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کے کہا سیٹھ تم بھی مجھے بے داغ فولاد کے انسان معلوم ہوتے ہو ایسا انسان جس میں کہیں کوئی سقم اور خامی نہ ہو کس قدر سچے اور دیانت دار مضبوط اور وقت کے پابند سچ کہتا ہوں اگر میرے بس میں ہوں تو میں تمہارے ایسے انسان کو ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دوں۔ وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوا، بولا'' میں دو سال میں ہندوستان کی کایا پلٹ کے رکھ دوں، سارا ملک ایک کارخانے کی طرح کام کرنے لگے۔ ہر انسان مشین کی طرح چلنے لگے۔ میں تو سب کو دو دن میں ٹھیک کر کے رکھ دوں مگر کیا کروں، آج کل جدھر دیکھو، جنتا راج! جنتا راج کی بکواس سنتا ہوں ہوں جنتا راج''

اتنے میں گرانٹ روڈ کا اڈا آ گیا اور میں وہاں اترنے لگا، وہ میرے ساتھ ساتھ نیچے اتر آیا۔ یکا یک مجھے کچھ خیال آیا، میں نے پلٹ کر اس سے کہا'' سیٹھ آپ مجھے باتیں کرتے کرتے غلطی سے یہاں گرانٹ روڈ تک چلے آئے حالانکہ آپ کو پچھلے اڈے پر باہے سنٹرل پر اترنا تھا۔''

وہ ہنس کر بولا ''نہیں وہ دراصل مجھے گرانٹ روڈ پر ہی اترنا تھا، میں ہر روز یہیں پر اترتا ہوں، ایک ڈھائی آنے کا ٹکٹ باہے سنٹرل کا لیتا ہوں اور یہاں گرانٹ روڈ پر آ کے اتر جاتا ہوں، ہر روز ٹکٹ میں دو پیسے کی بچت ہو جاتی ہے یہاں کون دیکھتا ہے؟''

اتنا کہہ کر اس نے مجھے آنکھ ماری، اور جلدی جلدی نکڑ سے گھوم کر غائب ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

بھگت رام

ابھی ابھی میرے بچے نے میرے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو اپنے دانتوں تلے داب اس زور سے کاٹا کہ میں چلائے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے غصے میں آ کر اس کے دو تین طمانچے بھی جڑ دیئے ہیں۔ بچارہ اسی وقت سے ایک معصوم پلے کی طرح چلا رہا ہے۔ یہ بچے کم بخت دیکھنے میں کتنے نازک ہوتے ہیں لیکن ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان کے دانت یوں تو دودھ کے ہوتے ہیں لیکن کاٹنے میں گلہریوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ اس بچے کی معصوم شرارت سے معاً میرے دل میں بچپن کا ایک واقعہ ابھر آیا ہے اب تک میں اسے بہت معمولی واقعہ سمجھتا تھا اور اپنی دانست میں اسے قطعاً بھلا چکا تھا۔ لیکن دیکھیے یہ لاشعور کا فتنہ بھی کس قدر عجیب ہے اس کے سہارے میں بھی کیسے کیسے عجائب مستور ہیں بظاہر اتنی سی بات تھی کہ بچپن میں میں نے ایک دفعہ اپنے گاؤں کے ایک آدمی بھگت رام کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا ڈالا تھا اور اس نے مجھے طمانچے مارنے کے بجائے سیب اور آلوچے کھلائے تھے اور بظاہر میں اس واقعے کو اب تک بالکل بھول چکا تھا۔ لیکن ذرا اس بھان متی کے پٹارے کی بوالعجبیاں ملاحظہ فرمائیے یہ معمولی سا واقعہ اک خوابیدہ ناگن کی طرح ذہن کے پشتارے میں دبا ہے اور جونہی میرا بچہ میری چھنگلیا کو دانتوں تلے دباتا ہے اور میں اسے پیٹتا ہوں، یہ پچیس تیس سال کا سویا ہوا ناگ بیدار ہو جاتا ہے اور پھن پھیلا کر میرے ذہن کی چار دیواری میں لہرانے لگتا ہے۔ اب کوئی اسے کس طرح مار بھگائے۔ اب تو اسے

دودھ پلانا ہوگا! خیر تو وہ واقعہ بھی سن لیجئے جیسا کہ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے جب ہم لوگ رنگپور گاؤں میں رہتے تھے رنگپور گاؤں تحصیل جوڑی کا صدر مقام ہے اس لیے اس کی حیثیت اب ایک چھوٹے موٹے قصبے کی ہے لیکن جن دنوں ہم وہاں رہتے تھے رنگپور کی آبادی بہت زیدہ نہ تھی یہی کوئی ڈھائی سو تین گھر ہوں گے جن میں بیشتر گھر برہمنوں اور کھتریوں کے تھے دس بارہ گھر جلاہوں اور کمہاروں کے ہوں گے پانچ چھ بڑھئی اتنے ہی چمار اور دھوبی اور یہی سارے گاؤں میں لے دے کے آٹھ دس گھر مسلمانوں کے ہوں گے لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس لیے یہاں تو ان کا ذکر کرنا بھی بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

گاؤں کی برادری کے مکھیا لالہ کانشی رام تھے، یوں تو براہمنی سماج کے اصولوں کے مطابق برادری کا مکھیا کسی براہمن ہی کو ہونا چاہیے تھا اور پھر برہمنوں کی آبادی بھی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی، اس پر برادری نے لالہ کانشی رام کو جو ذات کے کھتری تھے، اپنا مکھیا چنا تھا پھر وہ سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے، یعنی نئے شہر تک پڑھے تھے۔ جو خط ڈاکیا نہیں پڑھ سکتا تھا، اسے بھی وہ اچھی طرح پڑھ لیتے تھے تمسک ہنڈی، نالش، سمن، گواہی، نشان دہی کے علاوہ نئے شہر کی بڑی عدالت کی ہر کارروائی سے بخوبی واقف تھے اس لیے گاؤں کا ہر فرد اپنی ہر مصیبت میں چاہے وہ خود لالہ کانشی رام ہی کی پیدا کردہ کیوں نہ ہو۔ لالہ کانشی رام کا ہی سہارا ڈھونڈتا تھا اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہ کیا۔ اسی لیے وہ گاؤں کے مکھیا تھے۔ گاؤں کے مالک تھے اور رنگ پور سے باہر بھی وہ

دور تک جہاں تک دھان کے کھیت دکھائی دیتے تھے لوگ ان کے گن گاتے تھے۔

ایسے شریف لالہ کا منجھلا بھائی تھا لالہ بانشی رام، جو اپنے بڑے بھائی کے ہر نیک کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا، لیکن گاؤں کے لوگ اسے اتنا اچھا۔۔۔۔نہیں سمجھتے تھے کیونکہ اس نے اپنے برہمن دھرم کو تیاگ دیا تھا اور گورونانک جی کے چلائے ہوئے پنتھ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کرایا تھا اور ان کے شہر سے نیک صورت، نیک طینت، نیک سیرت، گرنتھی کو بلا کر اسے گاؤں میں سکھ مت کے پرچار کے لیے مامور کر دیا لالہ بانشی رام کے سکھ بن جانے سے گاؤں میں جھٹکے اور حلال کا سوال پیدا ہو گیا تھا مسلمانوں اور سکھوں کے لیے تو گویہ ایک مذہبی سوال تھا لیکن بھیڑ بکریوں اور مرغے مرغیوں کے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن افسانوں کے نقار خانے میں جانوروں کی کون سنتا ہے۔

لالہ بانشی رام کے چھوٹے بھائی کا نام تھا بھگت رام۔۔۔جس کا انگوٹھا میں نے بچپن میں چبا ڈالا تھا کس طرح یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔۔۔۔۔ابھی تو اس کا کردار دیکھیے۔یعنی سخت لفنگا، آوارہ، بدمعاش تھا یہ۔۔۔۔۔شخص نام تھا بھگت رام لیکن دراصل یہ آدمی رام کا بھگت نہیں شیطان کا بھگت تھا۔ رنگ پور کے گاؤں میں آوارگی، بدمعاشی ہی نہیں، ڈھٹائی اور بے حیائی کا نام اگر زندہ تھا محض بھگت رام کے وجود سے ورنہ رنگپور تو ایسی شریف روحوں کا گاؤں تھا کہ غالباً فرشتوں کو بھی وہاں آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہو گا۔ لیکن پاکیزگی اور۔۔۔عبادت کا ہلکا ہلکا سا نور گویا ہر ذی نفس کے چہرے سے چھٹتا نظر آتا

تھا۔ کبھی کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی۔ قرضہ وقت پر وصول ہو جاتا تھا اور نہ زمین قرق ہو جاتی تھی اور لالہ کانشی رام پھر روپیہ دے کر اپنے مقروض کو کام پر لگا دیتے تھے مسلمان بیچارے اتنے کمزور تھے اور تعداد میں اس قدر کم تھے کہ ان میں لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ سب بیٹھے مسجدوں کے مناروں اور اس کے کنگروں کو خاموشی سے تاکا کرتے کیونکہ گاؤں میں انہیں اذان دینے کی بھی ممانعت تھی، کیروں ارا چھوتوں کا سارا دھندا دو جنمے لوگوں سے وابستہ تھا اور وہ چوں تک نہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ احساس بھی نہ تھا کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے بس جو ہے وہ ٹھیک ہے یہی مسلمان سمجھتے تھے، یہی براہمن، یہی کھتری۔۔۔۔۔ یہی چمار اور سب مل کر بھگت رام کو گالیاں سناتے تھے کیونکہ اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔

بھگت رام لٹھ گنوار تھا بات کرنے میں اکھڑ دیکھنے میں اکھڑ، گندہ۔۔۔۔۔۔ ناتراش، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، بڑے بڑے ذات، بتیسی ہر وقت کھلی ہوئی، لبوں سے رال ٹپکتی ہوئی، جب ہنستا تو بتیسی کے ساتھ موڑھوں کی بھی پوری نمائش ہوتی۔ گاؤں میں ہر شخص کا گھٹا ہوا تھا اور ہر ہندو کے سر پر چوٹی تھی لیکن بھگت رام نے بلوچوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھا لیے تھے اور چوٹی غائب تھی بالوں میں بڑی کثرت سے جوئیں ہوتیں، جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بیٹھ کر چنا کرتا تھا۔ سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار رچایا جاتا، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور بیچ میں سے سیدھی مانگ نکال کر زلفیں سنوار کر وہ سر شام گاؤں کے چشموں کا طواف کیا کرتا۔ اپنی ان بری حرکتوں سے کئی بار پٹ چکا تھا

لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا بڑی موٹی کھال تھی اس کی اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن نہ ہوئی تھی وہ شرارہ ناپید تھا جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے بھگت رام سو فیصد حیوان تھا اور اسی لیے گاؤں والے برہمن اور کھتری، امیر اور غریب، ہندو اور مسلمان اور سنار اور چمار سب اس سے نفرت کرتے تھے۔

لیکن چونکہ لالہ کانشی رام کا چھوٹا بھائی تھا اور بظاہر گاؤں کے سب سے بڑے گھر کا ایک معزز فرد اس لیے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود گاؤں کے لوگ اس کے وجود کو اور اس کے وجود کی مذبوحی حرکات کو برداشت کرتے تھے اور آج تک کرتے چلے آتے تھے۔ لیکن جب ہم رنگپور میں آئے اس وقت بھگت رام کے بڑے بھائی نے پریشان ہو کر اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور تو ی کا ایک گھراٹ اس کے سپرد کر دیا تھا جہاں بھگت رام کام کرتا تھا اور رات کو سوتا بھی وہیں تھا، کیونکہ گھراٹ تو دن رات چلتا ہے۔ نہ جانے کس وقت کسے آٹا پسانے کی ضرورت درپیش ہو اور وہ چادر میں یا بھیڑ کی کھال میں مکئی یا گندم کے دانے ڈالے گھراٹ پر چلا آئے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ دن بھر جو گیہوں جمع ہوتا ہے یا جو اناج ابھی پسا نہیں جاتا وہیں گھراٹ پر دھرا رہتا ہے اور اس کی نگہبانی کے لیے بھی ایک آدمی کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر لالہ کانشی رام کا گھراٹ گاؤں میں سب سے نامی گھراٹ تھا یعنی تقریباً سارے گاؤں کا اناج وہیں پسوایا جاتا تھا۔ ایک اور گھراٹ بھی تھا لیکن بالعموم مسلمانوں، اچھوتوں اور کمیروں کے لیے اناج جہاں پسایا جاتا تھا۔ جب کبھی بڑا گھراٹ چلتے چلتے رک جاتا اور اس کی۔۔۔۔۔ مہیب چکی کام کرنے سے انکار کر دیتی یا جب پاٹوں کی

سطح پر پتھریلے دندانے۔۔۔۔۔بنانے کے لیے انہیں الٹا دیا جاتا تو اس صورت میں دوسرے گھراٹ والوں کو چند روز کے لیے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی بصورت دیگر بڑے گھراٹ پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ جب بڑا گھراٹ چلتا تھا، اس وقت کسی مسلمان، کسی کمیرے، کسی اچھوت کی یہ جرأت نہ تھی، جرأت تو کیا کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا اناج بڑے گھراٹ پر پس سکتا ہے شروع شروع میں جب بھگت رام نے کام سنبھالا تو اس نے بھی چند روز تک یہی وتیرہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں اس کے مزاج کے لاابالی پن نے بلکہ یوں کہیے کہ شیطانی پن نے زور مارا اور اس نے سوچا چلو جی کیا ہے اس میں، جو آئے پسائے، آٹا پسا کر لے جائے، ان پتھر کے دو پاٹوں میں دھرا ہی کیا ہے اور یہ آخر ہے اناج ہی تو ہے جسے کتا بھی کھاتا ہے اس سے گھراٹ کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو گا دوسرے گھراٹ کا حال جو پہلے ہی بہت پتلا ہے اور بھی پتلا ہو جائے گا عین ممکن ہے کہ دوسرا گھراٹ بالکل ہی بند ہو جائے، نہ جانے اس نے کیا سوچا، بہر حال اس نے کوئی ایسی ہی بری بات سوچی ہو گی جو اس نے گاؤں کے چماروں اور کمیروں کو بھی اپنے گھراٹ پر آٹا پسانے کی دعوت دی پہلے تو لوگوں نے بڑی شدو مد سے انکار کیا "بھلا ایسا بھی ہوسکتا ہے، کیا کہتے ہو لالہ، ہم رعیت ہیں، تم رامویہ تمہارا گھراٹ ہے ہمارا گھراٹ وہ ہے۔ ہم بھلا یہاں آٹا پسانے کیوں آئیں گے نابابا یہ کام ہم سے نہ ہو گا اور جو چاہے ہم سے کام لے لو یہ کام ہم سے نہیں ہونے کا" لیکن بھگت رام نے آخر اپنی چالاکیوں سے ان بیچاروں کو پھسلا ہی لیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اناج اسی کے گھراٹ پر لایا کریں اور وہیں پسایا

کریں۔

بھلا ایسی بات برادری میں چھپی رہ سکتی ہے۔ برادری میں اک کہرام مچ گیا، چہ میگوئیاں ہونے لگیں ہر روز بھگت رام سے لڑائی ہونے لگی تگڑا آدمی تھا اس لیے گالیاں سہہ گیا، ہنس ہنس کر ٹالتا گیا۔ پھر اس نے غصے میں آ کر دو چار کو پیٹ دیا۔ پھر ایک دن خود پٹ گیا۔ یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے لالہ کانشی رام کے پاس پہنچا۔ انہوں نے بھگت رام کو بلا کر ڈانٹا، سمجھایا، بجھایا، ٹھنڈے دل سے نرمی سے پچکار کر باتیں کیں، اونچ نیچ سمجھائی لیکن جس دل میں کمینہ پن ہو وہ دھرم کی بات کب سنے گا بھگت رام نے اس کان سے سنی اس کان سے نکال دی پہلے جب بھگت رام اپنے گھر پر رہتا تھا اس کے لیے تھوڑی بہت روک ٹوک بھی تھی یہ ڈر بھی تھا کہ بڑے بھائی کیا کہیں گے، لیکن اب تو وہ دن رات گھراٹ پر رہتا تھا اب اسے وہاں روکنے والا کون تھا اب وہ خوب کھل کھیلا انہی دنوں وہ بھنگ پینے لگا اور ایک مسلمان فقیر کے ہاں آنا جانا شروع کیا جو ان دنوں اپنی بیوی اور ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ندی کے کنارے ایک تکیے پر آ کر ٹھہرا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، بھگت رام گھراٹ کے کام سے غافل رہنے لگا اور ان کا بیشتر حصہ تکیے پر چرس اور گانجا پینے میں گزارنے لگا۔ بھائی نے بہتیرا سمجھایا خود گاؤں کے شریف مسلمانوں نے اس پر نفرین کے آوازے کسے لیکن وہ تو کسی اور ہی نشے میں چور تھا۔ چند دن اور گزرے اور پھر پتہ چلا کہ بھگت رام نے نئے شہر جا کر اس مسلمان فقیر کی بیٹی سے نکاح کر لیا اور اسلام قبول کر لیا ہے۔ سارے گاؤں میں ہلچل سی مچ گئی۔ جب انہوں نے بھگت رام کو سیاہ پھندنے والی سرخ رنگ کی اونچی ٹوپی پہنے

ہوئے دیکھا۔ فقیر تو خیر ڈر کے مارے پھر کبھی اس گاؤں میں گھسا ہی نہیں اور یہ اس نے اچھا کیا۔ ورنہ لالہ کانشی رام اور بانشی رام ضرور اس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے۔ لیکن اپنے بھائی کو وہ کیا کہہ سکتے تھے۔ جو اپنی بیوی کو لے کر پھر گاؤں میں آ گیا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے گھر اٹ پر آ کر بس گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہتے تھے اور۔۔۔۔۔ بھگت رام اب بڑا خوش تھا اور سفید لٹھے کی شلوار اور سیاہ اچکن کی واسکٹ جس پر کئی سوگنڈی دار بٹن لگے ہوئے تھے، گاؤں کی گلیوں میں فخریہ گھوما کرتا تھا اور گاؤں کی بہو بیٹیوں پر بلا امتیاز مذہب و ملت آوازے کستا تھا۔ ایسا دس نمبر کا بدمعاش تھا وہ کہ میری ماں جب مجھے گالی دیا کرتیں تو میرے خصائل کا مقابلہ بھگت رام کے اوصاف حمیدہ سے کیا کرتیں اور میں ہمیشہ رو دیتا۔ بھگت رام سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ایک تو اس نے ہمارا دھرم چھوڑ دیا تھا بھلا ایسے آدمی کا کیا اعتبار اور بھگت رام کی شیطنت دیکھو، مسلمان ہوتے ہی اس نے گاؤں کے مسلمانوں کو اکسانا شروع کیا کہ وہ مسجد میں منارے پر چڑھ کر اذان دیں۔ لیکن وہ تو بھلا ہو مسلمانوں کا، کسی نے اس کی بات نہیں مانی اور ڈرتے ڈرتے کہا کہ گاؤں میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا اس پر وہ بدمعاش بہت ہنسا اور اس نے خود وضو کر کے مسجد کے منارے پر چڑھ کر اذان دی اور اس کی گونجتی گرجتی ہوئی آواز نیچے وادی میں، ندی کنارے ناشپاتیوں کے جھنڈ میں اور دور دور، صنوبروں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چھاتیوں میں دھمک پیدا کرتی ہوئی گونج گئی اور گاؤں کے ہر برہمن اور کھتری کا دل اک نامعلوم خوف سے بھر گیا گھور کلجگ ہے۔ گھور کلجگ ہے یہ۔۔۔۔۔۔ اب کوئی دن میں نشکلنکی اوتار پیدا ہوں گے،

ہے رام ۔۔۔۔۔۔ ہے رام ۔۔۔۔اور لالہ کانشی رام نے برہمنوں سے مشورہ کر کے ایک بہت بڑا ایگیہ کیا اور پراشچت کیا اور اپنے چھوٹے بھائی بھگت رام کو برادری سے خارج اور جائیداد سے بے دخل کر دیا اور پرانے گھراٹ کے پانی کا بہاؤ موڑ کر ایک اور عمدہ سا گھراٹ بنایا۔ پرانا گھراٹ جہاں اب بھگت رام اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ اب بڑی خستہ حالت میں تھا گاہک کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے۔ مسلمانوں کے جو چند گھر باقی رہ گئے تھے انہوں نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ گاؤں کی سماجی زندگی میں بھگت رام نے جابجا سوراخ کر دیئے تھے۔ اور اسے کوئی پسند نہ کرتا تھا کہ یہ فقیرہ بیاہ سے پہلے ہی حاملہ تھی اور وہ فقیر بھگت رام کو جل دے کر خود فرار ہو گیا تھا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ، جتنے منہ اتنی باتیں ہاں یہ بات ضرور سچ تھی کہ بھگت رام ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی میں مصروف رہتا۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی محنت و مشقت کرنے پر آمادہ تھا لیکن گاؤں میں اب کوئی اسے کام دینے کو تیار نہیں تھا اور ایسے لوفر کے لیے بھلا اس شریف گاؤں میں کیا سبیل ہو سکتی تھی، مجھے وہ رات نہیں بھولتی جب بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ صبح ہی سے بھگت رام نے ہمارے گھر کے چکر لگانے شروع کیے تھے میری ماں کی ۔۔۔۔۔۔ منتیں کی تھیں اور اس کے پاؤں پر اپنا ماتھا ٹیک کر کہا تھا ''تم چلو گی ماں تو میری بیوی بچ جائے گی'' لیکن میری ماں جو بڑے بڑے کھتری گھرانوں اور برہمنوں کے گھر میں دایہ بن کر جاتی تھی۔ بھگت رام کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ آدھی رات کے وقت بھگت رام نے چیخ چیخ کر دہائی دی لیکن ہم لوگوں نے دروازہ نہیں کھولا اور مست مار کر سور ہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ بھگت

رام کی بیوی زچگی میں مرگئی ۔ بچہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا بھگت رام بہت رویا، زارو قطار رویا لیکن وہ کوئی سچے آنسو تھوڑے تھے، کسی انسان کے آنسو تھوڑے تھے ۔ ایک حیوان کے آنسو تھے جو یونہی اپنی تکلیف پرٹسوے بہا رہا ہو۔ کیونکہ چند دنوں ہی میں وہ اپنی فقیرنی کو بھول گیا۔ اب اس نے اپنا مسلمانی نام بھی ترک کردیا تھا اب وہ پھر اپنے آپ کو خدا بخش نہیں بھگت رام کہتا تھا اور اسی طرح گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا تھا لیکن شاباش ہے ہندوؤں کو کہ کسی نے اسے منہ نہیں لگایا حتیٰ کہ اس کے بھائی بھی اس سے بات کرنے کے روادار نہیں ہوئے اور بھگت رام اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

چند روز کے بعد بھگت رام گاؤں چھوڑ کر کہیں دور چلا گیا۔ تین چار مہینوں کے بعد جو لوٹا تو اس کے پاس دو تین درجن سانپ تھے اور بہت سے چھچھوندر اور نیولے اور ایسے ہی بہت سے جانور ایک پنجرے میں خوبصورت مینا تھی جو بہت اچھا گاتی تھی اور میں گھنٹوں اس مینا کے پنجرے کے قریب ہو کر سنا کرتا تھا اور گاؤں کے بہت سے لڑکے میری طرح بھگت رام کے پاس آیا کرتے تھے اور اب بھگت رام کے پاس بہت سی جڑی بوٹیاں تھیں ۔ جن کے متعلق وہ کہتا تھا کہ دنیا کی ہر بیماری کو یوں چٹکی میں دور کرسکتی ہیں ۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف کھنچنے لگے اور اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی ۔ میری ماں کو جو گاؤں کی مشہور دایہ تھیں اور عورتوں کے ہر روگ کا علاج جانتی تھیں ۔ بھگت رام کا یہ بہروپ بہت برا معلوم ہوا مگر اب وہ کیا کرسکتی تھیں ہاں جب کبھی ان دونوں کی مڈھ بھیڑ ہو جاتی وہ اسے خوب کھری کھری سناتیں ۔ بھگت رام یہ صلواتیں سن کر ہنس دیتا یا اپنا سر کھجانے لگتا اور پھر

اک زور کا قہقہہ لگا کر آگے چل دیتا۔ پرلے درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا وہ۔۔۔۔۔۔

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ بھگت رام کی جڑی بوٹیوں کی دھاک سارے گاؤں میں بندھ گئی۔ پھر قرب و جوار کے مریض بھی اس کے پاس آنے لگے۔ اب اس نے گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک چمار کی آدھی دکان کرائے پر لے لی اور وہاں بیٹھ کر دوائیاں بیچنے لگا آدھی دکان میں مولو چمار جوتیاں بناتا تھا مولو چمار اور اس کی بیوی اور اس کی بیوی بہن رام دئی بس یہ تینوں افراد ہر وقت جب دیکھو جوتیاں سیتے رہتے تھے۔ دکان کے دوسرے حصے میں بھگت رام نئے گاہکوں کو پھانستا تھا اور سانپوں کا تماشا دکھاتا تھا اور اپنی زبان کو سانپوں سے ڈسواتا تھا اور خود سنکھیا کھا کر بتاتا تھا کہ اس پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایک تیر بہدف جڑی بوٹیاں تھیں جو ہر قاتل سے قاتل زہر کے لیے تریاق کا حکم رکھتی ہیں الغرض اسی قسم جھوٹی گپیں ہانک کر اور شیخیاں بگھار کر وہ اجڈ گنوار اور بھولے بھالے دیہاتیوں سے پیسے بٹورتا تھا اور میری ماں کو اس کی باتیں سن سن کر بہت غصہ آتا تھا۔ لیکن ہم لوگ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے کیونکہ لوگوں کو اس پر اعتقاد سا ہو گیا تھا اور اب اس کے پاس روپے بھی تھے اور اس نے گاؤں سے باہر ندی کے اس پار مٹی کا ایک کچا سا گھر بھی بنا لیا تھا۔ جہاں وہ فرصت کے وقت اپنا چھوٹا سا باغیچہ بنانے میں مصروف ہوتا۔ مجھے بھگت رام سے بڑی نفرت تھی اور میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا تھا لیکن اب وہ اس خوبصورت مینا کو جو دکان کے باہر لٹکے پنجرے میں گاتی رہتی تھی، اپنے گھر لے گیا تھا اس لیے میں کبھی کبھی اس کے گھر

محض اس مینا کو دیکھنے کے لیے چلا جایا کرتا۔ خیریت ہوئی اس نے مجھے ٹوکا نہیں ورنہ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر اس نے مجھے کبھی ٹوکا تو گونپے میں ڈھیلا رکھ کر بھگت رام کا سر پھوڑ دوں گا۔

بھگت رام کا کام اب ترقی پر تھا لیکن انہی دنوں اس نے ایسی حرکت کی گاؤں کے لوگ پھر اس سے بدظن ہو گئے اور اس واقعے کے بعد گاؤں میں اور قرب و جوار کے گاؤں میں کبھی اس کی ساکھ نہ بندھی، واقعہ دراصل یہ تھا کہ رام دئی، جو کہ مولو چمار کی بیوی بہن تھی اور لالہ بانشی رام کی داشتہ تھی اور ہر ممکن احتیاط کے باوجود حاملہ ہو گئی تھی اور لالہ بانشی رام نے در پردہ بھگت رام کو کہلا بھیجا تھا کہ کوئی ایسی دوائی دے جس سے رام دئی کا حمل اسقاط ہو جائے۔ لیکن بھگت رام تو ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا وہ بھلا ایسے موقعے پر کسی شریف آدمی کی مدد کیوں کرتا۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔ الٹا اس معاملے کی یہاں تک تشہیر کی لالہ بانشی رام کو چند ماہ کے گاؤں چھوڑ کر نئے شہر جانا پڑا اور رام دئی کے لیے منہ چھپانا مشکل ہو گیا۔ یہ واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ جب لالہ بانشی رام کے بڑے بھائی کانشی رام نے میری ماں جو ان کی خاندانی دایہ تھی اس نازک معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کہا تو انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا نتیجہ یہ بیچاری رام دئی نو مہینے اس حرامی بیٹے کو اپنے پیٹ میں لیے لیے پھری اور گاؤں بھر میں اس کی بے عزتی ہوئی اور حرامی بچہ اس نے الگ جنا اس پر اس کی برداری نے اسے ''جات باہر'' کر دیا اور اس کے بھائی اور اس کی بیوی نے اسے گھر سے باہر نکال دیا اس حالت میں اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا اور جب وہ کئی دن سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی

تھی اور اپنے بچے کو دودھ کے لیے خود اس کے تھنوں میں دودھ نہ رہا تھا ہو بھگت رام کے گھر پہنچی وہ بدمعاش جیسے اس کے انتظار ہی میں تھا۔ اس نے جھٹ اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور بغیر کوئی شادی بیاہ کیے، یونہی وہ لوگ ہنسی خوشی رہنے لگی۔ گاؤں میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا، یہ اندھیر نگری۔۔۔۔۔یہ بے راہروی۔۔۔۔بے شرمی، بے حیائی، اپنی آنکھوں سے دیکھی نہ جا سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بھگت رام کی دکان اٹھوا دی گئی اور اسے اچھی طرح جتا دیا گیا کہ اس واقعے کے بعد اگر وہ کبھی گاؤں کا رخ کرے گا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

بھگت رام اب اپنے گھر میں ہی رہتا تھا اور باغیچے اور گھر کے آس پاس جو اس نے تھوڑی سی زمین مول لی تھی اس میں کاشت کر کے اپنا اور رام دئی اور اس کے حرامی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑی اداس زندگی بسر کرتا ہے یہ خیال بالکل غلط ہے جیسے پکے گھڑے پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان تمام واقعات نے بھگت رام کی فطرت پر کوئی اثر نہیں کیا اس کی سرشت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس نے کوئی گناہ بھی کیا ہے۔ اسے اس امر کا خیال ہی نہیں تھا کہ اس نے اپنے طرز عمل سے اپنے ماں باپ، اپنے خاندان، اپنے گاؤں کی عزت کو بٹہ لگایا ہے، وہ اسی طرح خوش وخرم اور شاداں وفرحاں نظر آتا تھا کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔جیسے وہ اب بھی گاؤں کے اندر اپنے بھائی کے خوبصورت گھر میں جس کی چھت ٹین کی تھی رہتا ہو۔ میں ایک اسے اس کے گھر میں دوپہر کے وقت دیکھا تھا۔ وہ آنگین میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور رام دائی کو چوم رہا تھا میں نے اس سے پہلے کسی مرد کو

عورت کو چومتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔اس لیے یہ منظر دیکھ کر میں تو اک دم بھونچکا رہ گیا اور میرے کانوں میں میری ماں کے الفاظ گونجنے ''کبھی بھول کر بھی بھگت رام کے گھر کا رخ نہ کرنا وہ بڑا ہی ۔۔۔۔۔بد معاش ہے۔''میری ماں نے سچ کہا تھا بھلا شریف لوگ کہیں ایسے ہوتے ہیں غم و غصے سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔میں واپس جانے وک تھا کہ مینا نے مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے چلانے لگی'' آؤ آؤ ننھے منے بالک مٹھائی دوں گی''مینا کی آواز سن کر بھگت رام جلدی سے اٹھا اور میری طرف بڑھا، شاید وہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔بد معاش میں تیرے قابو میں آسانی سے نہیں آؤں گا، ڈاکو میں روتا ہوا آگے آگے بھاگا۔ پیچھے پیچھے بھگت رام دوڑتا ہوا آ رہا تھا کہہ رہا تھا''بات تو سن، بیٹے، بات سن بیٹے''پر میں ایسا بیوقوف نہ تھا کہ رک جاتا میں بھاگتا گیا یکا یک اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور میں نے کٹکٹا کر اس کے انگوٹھے کو اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور اتنے زور سے کاٹا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا مگر اس نے مجھے طمانچے نہیں مارے کچھ نہیں کیا، لیکن مجھے چھوڑا بھی نہیں وہ مجھے اپنے گھر کے آنگن میں لے گیا۔ مجھے گردن سے پکڑے ہوا تھا کم بخت، میں اب بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔اس نے رام دائی کی طرف اشارہ کر کے کہا''یہ تمہاری موسی ہیں انہیں رام رام کہو۔''

میں نے کہا''موسی تمہاری ہو گی، میں انہیں رام رام نہیں کہوں گا''

اس نے ہنس کر کہا''دیکھو یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے منو اس کے ساتھ کھیلو''

میں نے کہا میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گا میری ماں کہتی ہیں کہ رام دئی کا بچہ حرامی ہے، حرامی ہے یہ بچہ۔۔۔۔۔۔۔۔!

معارام دئی نے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹالیا بھگت رام کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس کے بدصورت کریہہ دانت اور مسوڑھے ہونٹوں کے باہر نکل آئے، کہنے لگا'' سیب کھاؤ گے؟ سیب کھاؤ گے؟ آلو چے؟ آلو چے؟ ہاہاہا!''

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا

اس نے زبردستی بہت سے سیب اور آلو چے میری جیبوں میں ٹھونس دیئے پھر مسکرا کر بولا'' یہ مینا تمہیں اچھی لگتی ہے نا لے جاؤ اسے''

وہ پنجرا اتار کر میرے حوالے کرنے لگا

میں نے کہا'' کوئی تھوکتا بھی ہے اس تمہاری مینا پر، میری ماں کہتی ہیں کہ بھگت رام آدمی نہیں حیوان ہے وہ چمار سے بھی بدتر ہے، چھوڑو مجھے، مجھے نہیں چاہیے تمہاری مینا و ینا۔۔۔۔!''

اسے ہنس کر مجھے چھوڑ دیا، کہنے لگا'' تو اب بھاگ جاؤ''

اس بدمعاش کے پنجے سے نکل کر جو میں بھاگا ہوں تو سیدھا گھر آ کے دم لیا گھر آ کر ماں کو جو میں نے سارا قصہ سنایا تو پہلے تو مجھ پر بہت بگڑیں۔ پھر بھگت رام کو انہوں نے خوب خوب کوسا اور سارے سیب اور آلو چے اٹھا کر گلی میں پھینک دیئے۔

اس کے بعد میں کبھی رام بھگت کے گھر پر نہیں گیا۔

چند مہینوں کے بعد جب لالہ بانشی رام نئے شہر سے لوٹا تو اس نے مولو چمار سے کہہ دن کر بھگت رام پر بدچلنی اور اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا چھ سات مہینے بھگت رام جیل میں رہا، آخر کار وہ بری ہو گیا۔ لیکن جیل میں رہ کر اس کی صحت کافی کمزور

ہو گئی تھی اور اب وہ جیل سے چھوٹ کر آیا تو لوگ کہتے تھے کہ اس کے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی نہ وہ اب سینہ تان کر چلتا تھا کچھ جھکا جھکا سا تھا۔ کچھ اداس اداس لیکن یہ کیفیت بھی چند روز تک رہی پھر اسی طرح ڈھیٹ بے شرم، بے حیا بن کر ادھر ادھر گھومنے لگا اور گاؤں گاؤں جا کر اپنی جڑی بوٹیوں کی تجارت کرنے لگا لیکن شریف لوگ اسے منہ نہیں لگاتے تھے اور اس کے سائے سے بھی پرہیز کرتے تھے، ہندو، مسلمان، کمیرے ہر مذہب اور ہر جات کے لوگ اسے آوارہ اور شہدہ سمجھتے تھے اور ہمارے گاؤں میں تو اس کی برائی ضرب المثل بن چکی تھی اور مائیں ہمیں درس اخلاق دیتے وقت کہا کرتی تھیں "دیکھو جی، اگر کوئی برا کام کرو گے تو تمہارا حال ہو گا جو بھگت رام کا ہوا ہے۔"

جیسی بے معنی، بے مطلب اس کی زندگی تھی ویسی ہی اس کی موت تھی بالکل مہمل لا معنی۔۔۔۔۔

میں نے اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن جن لوگوں نے اسے مرتے ہوئے دیکھا ہے وہ اس کے پاگل پن پر آج تک ہنستے ہیں کہتے ہیں، مرنے سے پہلے وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ندی کے کنارے رام دائی کے ساتھ کھڑا تھا اور ان طوفانی لہروں کا تماشا دیکھ رہا تھا جو برساتی بارش کی وجہ سے ندی کی سطح کو گرداب فنا بنائے ہوئے تھیں یکایک اس نے اپنے کنارے کے قریب بھیڑ کے تین چار بچوں کو دیکھا جو ان ہلاکت آفرین لہروں کی گود میں خوفزدہ آواز میں ابا ابا کہتے ہوئے بہتے چلے آ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھگت رام نے ان کی طرف دیکھا دوسرے لمحے وہ ندی کی طوفانی لہروں کی آغوش میں تھا اور بھیڑ کے بچوں کو بچانے

کی ناکام سعی کر رہا تھا اسی کوشش میں اس نے اپنی جان بھی دے دی دوسرے دن جب طوفان تھم گیا تو اس کی لاش ندی کے غربی موڑ پر تنک کے ایک تنے سے لپٹی ہوئی پائی گئی جس کا آدھا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیسی جاہلانہ، احمقانہ، بیوقوفانہ موت تھی یہ حیوانی زندگی، حیوانی موت، حسن ترتیب اور حسن توازن سے عاری، بھلا ایسی موت بھی کوئی تک ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے بھائیوں نے اچھا کیا اسے معاف کر دیا اور گو وہ برادری سے خارج ہو چکا تھا اور اب وہ نہ ہندو رہا نہ مسلمان نہ اچھوت، پھر بھی انہوں نے اپنے دھرم کے مطابق اس سے اچھا سلوک کیا وہ اس کی لاش گھر لے گئے، اسے نہلایا دھلایا۔۔۔ اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اسے شمشان گھاٹ لے جا کر آگ لگا دی میں اس وقت وہیں موجود تھا۔

لیکن یہ 1920ء کی بات ہے آج 1944ء ہے اور میرے ننھے بیٹے نے میری چنگلیا کو زور سے کاٹ کھایا ہے اور میں نے غصے میں آ کر اسے دو تین طمانچے جڑ دیئے ہیں اور معصوم بچہ صوفے پر منہ چھپائے رو رہا ہے اور میں سوچتا ہوں، آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام کہ تم جو دس نمبر کے بدمعاش تھے اور تمہارا کوئی مذہب نہ تھا۔ تم جو ایک گنوار اجڈ، جھوٹے پنساری تھے اور جڑی بوٹیاں بیچتے تھے اور لوگوں کو ٹھگتے تھے اور ان سے روپیہ بٹورتے تھے اور ایک مسلمان فقیرنی سے نکاح کیے ہوئے تھے اور ایک اچھوت بیوہ سے جھوٹ موٹ کا بیاہ رچائے ہوئے تھے بھگت رام تم جو جیل کی ہوا کھا چکے تھے اور گاؤں بھر کے مانے ہوئے لفنگے اور غنڈے تھے۔۔۔۔۔ تم جس سے لوگ نفرت کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں ایک میرے گاؤں میں ہی نہیں، ہر گاؤں، ہر شہر، ہر جگہ میں۔۔۔۔۔ آج میں

سوچتا ہوں بھگت رام شاید میں نے تمہیں پہچانا نہیں ۔شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی، شاید تم ان تمام بڑے آدمیوں سے بڑے ہو، اچھے ہو، بہتر ہو جو ملیں بناتے ہیں اور لوگوں کو بھوکا مر جانے دیتے ہیں جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور خدا کی مخلوق کو گلیوں میں پھرنے پر مجبور کرتے ہیں جو نادار عورتوں سے ان کی عصمت چھین کر عصمت پرست بنتے ہیں جو اپنی وقتی بیویوں کے قحبہ خانے اور اپنی اولاد کے لیے یتیم خانے تعمیر کرتے ہیں اور سماج کے مندر میں بیٹھ کر ان پر لعنت بھیجتے ہیں ہاں تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو جو ٹریکٹر، ہوائی جہاز، سکول، مشین گن، تھیٹر، سینما، ایمپائر بلڈنگ، ناچ گھر، بنک، یونیورسٹی، سلطنت، تخت طاؤس، کتبے، اپنسد، فلسفہ، زبان اور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور آدمی کی نسل کو کائنات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیران و پریشان چھوڑ دیتے ہیں تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو اچھے ہو، بھگت رام کیونکہ تم پنساری ہو، جڑی بوٹیاں فروخت کرتے ہو، آوارہ مزاج ہو نہیں نہیں تم سچ مچ شاعر ہو، بھگت رام، تم وہ شاعر ہو جو ہر صدی میں ہر برس میں، ہر جگہ، ہر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے، لیکن لوگ اچھے لوگ، نیک لوگ، بڑے لوگ اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں تم وہ شاعر ہو دوست آؤ۔۔۔۔ہاتھ ملاؤ!

لیکن بھگت رام اب مجھ سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ وہ مر چکا ہے 1920ء کی طغیانی میں بھیڑ کے بچوں کو بچاتے ہوئے مر گیا تھا اور وہیں ندی کے کنارے اس کی چتا سے شعلے بلند ہو کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے لال لال شعلے، شعلوں کے پتے، شعلوں کی کلیاں، شعلوں کے پھول اس کی چتا سے کھل رہے تھے اور چتا

جل رہی تھی اور کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے اور قدرت بھی اداس نہ تھی۔ آسمان صاف تھا نیلا گہرا، خوبصورت، دھوپ بھی صاف تھی، کھلی ہوئی چمکدار، نرم اور گرم اور کہیں کہیں بادلوں کے سپید سپید سبک اندام راج ہنس تیر رہے تھے اور ندی کا پانی گیت گاتا ہوا بھنور بناتا ہوا، لہروں کے جال تنتا ہوا اس کی چتا کے قریب سے گزر رہا تھا اور چتا کے پاس ہی کھلے اناروں کے جھنڈ میں شعلہ بداماں پھول دہک رہے تھے، کائنات خوش تھی۔ خدا خوش تھا خود شاعر خوش تھا۔ کیونکہ آج اس کا دل شعلہ بن گیا تھا اور اس کی دفعہ پھول یہ شعلے جو تمہارے دل میں ہیں یہ پھول جو ہر جگہ ہیں تمہارے اندر ہیں اور میرے اندر ہیں اور پھر اندر باہر، سب جگہ، ہر جگہ، کائنات اور شاعر اور آدمی ایک ہو گئے تھے۔ ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے۔

بھگت رام!۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

پاگل پاگل

شریف اپنی محبوبہ نازلی کے ساتھ سادھوواسوانی پارک میں بیٹھا تھا۔ یہ پارک باندرہ بس اسٹینڈ کے بالکل قریب اورایسور پٹرول پمپ کے سامنے واقع ہے کوئی خاص آڑ کی جگہ نہیں ہے مگر شام کا وقت تھا اور یہاں نیم کے دو گھنے پیڑ ہیں اور اشوک کے پیڑوں کی ایک لمبی سی قطار ہے جو آج سے دس برس بعد محبت کے ماروں کے لئے خاصی آڑ پیدا کردے گی۔ وہ وقت آنے تک یہاں ہاتھ میں ہاتھ دیئے تو بیٹھا ہی جا سکتا تھا اور کچھ نہیں تو پلکوں کی گھنی آڑ میں بہت سی باتیں کہی اور سنی جا سکتی ہیں۔

مگر شریف اور نازلی کے یہاں بیٹھنے کی وجہ ایک اور تھی نازلی کا مکان اس پارک کے بالکل سامنے تھا یہاں سے سامنے کی بالکونی صاف نظر آتی تھی جس پر کھڑی ہوئی نازلی کی چھوٹی بہن آسیہ، نازلی کو ہر خطرے سے اشارہ کرکے آگاہ کر سکتی تھی۔ نازلی کی ماں باندرہ لوکل ٹرین اسٹیشن کے برابر والی گلی میں فرش پر بیٹھنے والی سبزی بھاجی بیچنے والیوں سے سبزی خریدنے گئی تھی۔ شام کے وقت سبزی بھاجی سستی ملتی ہے سبزی والیاں اس وقت سبزی کا ٹوکرا کسی قیمت پر خالی کرکے گھر جانے کے لیے بےتاب رہتی ہیں، کچھ بھاؤ تاؤ ہو جاتا ہے، کچھ آپس کی سکھ دکھ کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ خریدنے والیوں اور بیچنے والیوں کے درمیان وقتی طور پر مشورے اور محبت کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے کچھ گھر کی باتیں، کچھ میکے سسرال کی باتیں، کچھ بچوں کی باتیں، کدو، بینگن اور بھنڈی کے ساتھ شوہر بھی ترازو میں

تلملاتا رہتا ہے اور ہمیشہ کم وزن ثابت ہوتا ہے مردوں کی خریداری بھی کوئی خریداری ہے؟ تھیلا کھولا، بھاجی کو اس میں ڈالا، پیسے پھینکے اور غائب، بھاجی کا بازار تو ایک سوشل کلب ہے نازلی کی ماں بھاجی خریدنے گئی ہیں ایک گھنٹے سے پہلے نہیں لوٹ سکتیں پھر بھی ان کے آنے کی راہ نازلی اور شریف کی نگاہوں میں ہے وہ بائیں طرف سے تربتی لین کے موڑ سے گھوم کر آئیں گی تو صاف نظر آجائیں گے۔

نازلی کے ابا اس وقت مولوی خیر الدین کے ہاں حقہ پینے گئے ہیں۔ پھر وہاں سے یوپی ریستوران کے کباب کارنر میں بیٹھ کر دونوں دوست کچھ چکھیں گے، ان دنوں کو یاد کریں گے جب عورتیں پردہ کرتی تھیں لڑکے بزرگوں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے تھے اور گڑ روپے کا پانچ سیر ملتا تھا۔ ابا جی کے آنے کی راہ بھی طے شدہ ہے۔ وہ بائیں طرف سے تعلق روڈ سے آئیں گے اس وقت دائیں بائیں اور سامنے تینوں طرف سے نازلی کا گھر ان دو چاہت کے ماروں کی نظروں کے سامنے ہے کوئی خطرہ نہیں آسیہ بالکونی میں بیٹھی کشیدہ کاری میں بظاہر مصروف ہے مگر اس کی نگاہیں ہر لحظہ آگے پیچھے دائیں بائیں پھرکی طرح گھومتی ہیں۔ آسیہ گیارہ برس کی ہے، مگر کبھی وہ بھی پندرہ برس کی ہوگی، کبھی اس کا بھی تو وقت آئے گا پھر سات برس کی فوزیہ اس کے لیے پہرہ دیا کرے گی۔

نازلی نے کسی قدر مایوسی کے عالم میں کہا ''اس طرح یونہی ہم کب تک ملتے رہیں گے؟''

شریف بولا ''کہو تو تمہارے گھر پیغام بھجوا دوں؟''

''کہو گے کیا؟ بلکہ کہلواؤ گے کیا؟''

یہ کہا جائے گا کہ لڑکا فلم انسٹی ٹیوٹ میں ڈائرکشن کورس کر رہا ہے ڈپلوما لیتے ہی ڈائریکٹر بن جائے گا

''ابا جی تو فلم کا نام سنتے ہیں کانوں پر ہاتھ رکھ لیں گے''

''ہاں مگر فلم تو وہ دیکھتے بھی ہیں وہ اور مولوی خیر الدین اور یوپی ریستوران کے مالک معراج میاں اکٹھے چھپ کر پکچر دیکھنے جاتے ہیں تم نے مجھے خود بتایا ہے''

''وہ تو ٹھیک ہے'' نازلی بولی ''مگر ابھی تو تم کچھ کماتے دھماتے نہیں ہو وہ کیسے مانیں گے؟''

''اسی لیے تو کہتا ہوں ایک سال ہی کی تو بات ہے ایک سال اور رک جاؤ ایک سال بعد ڈائرکشن کورس کرتے ہی پچیس ہزار کا ڈائریکٹر ہو جاؤں گا''

''سچ؟'' نازلی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، جیسے وہ بڑے بڑے پوسٹروں پر ہدایت کار محمد شریف، کا نام دیکھ رہی ہو۔

یکا یک آسیہ نے سامنے کی بالکونی سے اٹھ کر ایک سرخ رومال زور سے ہلایا۔ نازلی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی بولی ''میں جاتی ہوں ابا جی آ رہے ہیں''

آسیہ نے دور سے ابا جی کو دیکھ لیا تھا لال رومال ابا جی کی آمد پر کھلتا تھا، نیلا رومال امی کی آمد پر نازلی نے چوکڑی بھری اور مغربی گیٹ سے نکل کر پارک کے پچھواڑے کی سڑک سے ہوتی ہوئی، اپنے گھر کی طرف بھاگی بھاگی چلی گئی۔ جلدی میں شریف اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ دوبارہ ملنا کب ہو گا۔ خیر، بعد میں کوئی ترکیب نکالی جائے گی۔۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ کر نیم کے پیڑ کے نیچے بچھے ہوئے

بنچ سے اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا زرد رو نوجوان بھاگتا، لڑکھڑاتا پارک میں داخل ہوا اور دوڑتے دوڑتے شریف سے چند قدموں کے فاصلے پر اچانک تیورا کر گر پڑا۔ اس کا سر رائل پام کے گملے سے زور سے ٹکرا گیا تھا۔

کچھ دیر تو شریف بھونچکا کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر اور جھک کر اس نے اس نوجوان کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں۔ رخسار زرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ اسکے ہاتھ پاؤں سیدھے کرتے ہوئے شریف نے غور سے بے ہوش نوجوان کے سر کا معائنہ کیا بلا شبہ سر زور سے پتھر کے گملے سے ٹکرایا تھا، سر سے خون نہیں بہہ رہا تھا اور بظاہر سر پر چوٹ کا کوئی نشان بھی نہ تھا پھر بھی ظاہر تھا کہ یہ نوجوان سر کی اندرونی چوٹ سے ہی بے ہوش ہوا ہے۔

شریف نے ادھر ادھر دیکھا پارک میں اتفاق سے اس وقت کوئی دوسرا نہ تھا پارک کے پچھواڑے دائیں بائیں راستہ چل رہا تھا سامنے سڑک پر چار راستے پھوٹتے ہیں ایک راستہ باندرا اسٹیشن کو جاتا ہے، دوسرا کارٹر روڈ کی طرف، تیسرا باندرہ مسجد کی جانب، چوتھا لنکنگ روڈ اور ہاں پانچواں راستہ بھی ہے! گھوڑ بندر کو جانے والا راستہ آٹو میٹک روشنیوں کے انتظام کے علاوہ یہاں دو سنتری ہر وقت چوکس کھڑے رہتے ہیں۔

شریف نے ایک سنتری کے پاس جا کر کہا ''ایک آدمی پارک میں بے ہوش ہو گیا ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟'' سنتری نے جواب دیا ''شام کا وقت ہے ٹریفک کا عالم

دیکھتے ہو اس وقت ڈیوٹی چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔''

''تو میں کیا کروں؟''شریف نے بے بسی کے عالم میں سنتری سے مشورہ طلب کیا

شنتری کو شریف کے چہرے پر عجیب معصومیت اور ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ نرمی سے بولا''اسے ٹیکسی میں بٹھا کر ہسپتال لے جاؤ''

شریف نے ادھر ادھر دیکھا، پانی کا نل کہیں نہیں تھا۔ ورنہ پانی لے کر دو چار چھپکے بے ہوش نوجوان کے چہرے پر مار کر اسے ہوش میں لانے کی ترکیب کرتا۔

سامنے داؤد بھائی فرنیچر والے کی دکان کے برابر میں فاروق میاں پھل والے کی دکان تھی۔ فاروق اور شریف کسی زمانے میں اکٹھے ایک ہی سکول میں پڑھا کرتے تھے، پھر شریف چلا گیا اور فاروق نے یہ پھلوں کی دکان کر لی اب فاروق کم سے کم پندرہ سو روپیہ اس دکان سے کما لیتا ہے شریف فاروق کی دکان سے سنترے اور موسمی کا ملکسڈ جوس ایک گلاس میں بھر کر لے گیا اور واپس واسوانی پارک میں چلا گیا۔

بے ہوش نوجوان کے جسم میں تھوڑی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔شریف اسے گھسیٹ کر نیم کی چھاؤں میں لے آیا۔اس نے نوجوان کے سر کو اپنی گود میں لے کر اس کے ہونٹوں کے اندر پھلوں کا رس ٹپکانا شروع کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نوجوان کے سر کو سہلانا شروع کیا۔دھیرے دھیرے نوجوان رس پیتا چلا گیا۔ پہلے مشکل سے پھر آسانی سے، آخر جب گلاش ختم ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عجیب گہری ڈوبی ہوئی وحشت ناک آنکھیں تھیں۔ سارے چہرے پر جیسے کھال

منڈھی ہوئی تھی ایسا لگتا تھا کہ کئی دن سے اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' شریف نے گہری ہمدردی سے پوچھا

''غوں!'' نوجوان نے جواب دیا

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ایں؟''

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''غاں''

شریف کو یقین آ گیا کہ پتھر کے گملے ٹکرا جانے سے چوٹ کہیں اندر لگی ہے دماغ مختل ہو گیا ہے بے چارے کا

''کہاں جاؤ گے؟'' شریف نے بڑی نرمی سے کہا

''فرنٹ!'' اس نوجوان کے منہ سے نکلا

بے چارہ پاگل ہو گیا ہے شاید!'' شریف نے سوچا، اگر اسے چند گھنٹے آرام اور دماغی سکون ملے گا تو عقل پلٹ آئے گی ایسا ممکن تو ہے اس نے کئی کتابوں میں پڑھا ہے''

یہ سوچ کر شریف نے ایک ٹیکسی لی اور نوجوان کو باندرہ سے اپنے کانونٹ ایوی نیو، سانتا کروز واقع گھر میں لے آیا۔ شریف اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا تھا اس کی ماں ایک کالج میں پرنسپل تھی اور شریف کی ہمدردیوں سے نالاں رہتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی ''اب کس کو لے آئے؟''

شریف ایک دم بھڑک کر بولا ''اس کی حالت نہیں دیکھتی ہو، امی بے چارہ پتھر

کے ایک گملے سے ٹکرا کر اپنا عقل و شعور کھو بیٹھا ہے۔۔۔۔ذرا ایک پلنگ پر اس کے لیے بستر بچھا دو چند گھنٹے سو لے گا تو یقیناً ہوش میں آجائے گا"

ماں نے مکمل بے اعتباری عالم میں کئی بار خاموشی سے سر ہلایا مگر وہ اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف تھی۔اس نے ایک پلنگ پر بستر بچھا دیا۔ملازم قاسم،امی اور شریف تینوں نے مل کر اسے بستر پر لٹا دیا۔مگر بستر پر لیٹ کر بھی وہ نوجوان پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔پر منہ ہی منہ میں بدبدا کر بولنے لگا

"انگ۔۔۔۔انگ۔۔۔۔۔انگ۔۔۔۔۔۔۔"

"انگ کیا؟"شریف نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے پوچھا

"انگ۔۔۔۔۔انگ"اس نوجوان نے بڑی مشکل سے کہا

"انگارے؟"شریف نے پوچھا

شریف کی امی نے تیزابی لہجے میں کہا"ہاں ہاں،اس کے ماتھے پر انگارے رکھو خود بخود ہوش میں آجائے گا۔"

"امی۔۔۔۔۔۔امی! کیوں مذاق کرتی ہو؟ انسانیت بھی کوئی چیز ہے؟ کہ نہیں"

شریف نے غصے میں کہا

"انگ۔۔۔۔۔"وہ نوجوان پھر بدبدایا

شریف بولا"اسے کچھ یاد آرہا ہے،اس کا شعور واپس آرہا ہے"پھر اس نے نوجوان کی طرف جھک کر پوچھا

"انگوچھا؟"

نوجوان نے انکار میں سر ہلایا

''انگر کھا؟''

نوجوان نے پھر انکار میں سر ہلایا

''انگوا لا کے فرنٹ پر جانا چاہتا ہوگا شاید اسے وہیں بھیج دو''

شریف کی ماں نے طنز آمیز لہجے میں کہا وہ اور کچھ بھی کہنے والی تھی مگر اپنے بیٹے کی شعلہ بار نگاہوں کو دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

''انگور؟'' یکا یک شریف نے پوچھا

نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اس نے آہستہ سے سر ہلایا

''انگور کھاؤ گے؟'' شریف نے بڑی نرمی سے پوچھا

نوجوان نے پھر ''ہاں'' میں سر ہلایا

شریف کی ماں نے غصے سے منہ پھیر لیا مگر شریف کسی کی سننے والا نہیں تھا اس نے فرج کھول کر انگور کے دو گچھے نکالے اور انہیں پلیٹ میں رکھ کر اس نوجوان کے منہ میں ایک ایک کر کے ڈالنے لگا۔

کوئی ایک کلو انگور کھا کر اس نوجوان نے لمبی سانس اور کروٹ بدل کر پلنگ پر سو گیا

دو گھنٹے بعد وہ نوجوان خود بخود اٹھا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھ کر بولا'' مجھے یہاں کون لایا؟''

شریف یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ س پاگل کی عقل لوٹ آئی ہے۔۔۔۔۔شریف نے اس کو پورا قصہ سنا دیا۔

نوجوان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہا ''اس لیے۔۔۔۔۔۔ابھی تک۔۔میرا سر لہرا رہا ہے، مجھے گھر جانا چاہیے''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''کلیان میں''

''بمبئی سے کلیان لوکل ٹرین جاتی ہے میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں''

''نہیں نہیں، میں خود چلا جاؤں گا'' وہ نوجوان پلنگ سے اٹھ کر بولا

پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا ''مگر میرا بٹوا کہاں ہے؟''

''تمہارا بٹوا؟'' شریف نے پوچھا ''کیا تمہاری جیب میں نہیں؟''

نوجوان نے اپنی پتلون کی دونوں جیبیں ٹٹولیں اور شبہ کی نگاہوں سے شریف کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارے بٹوے میں کتنے روپے تھے؟'' شریف نے رک کر پوچھا

''بیس روپے'' نوجوان نے کسی قدر برہمی سے جواب دیا

شریف اس نوجوان کو کھار اسٹیشن تک چھوڑ آیا وہ بے حد خوش تھا کہ ایک نوجوان کا مختل دماغ ٹھیک ہوگیا ہے اور اب وہ عام انسانوں کی طرح ٹھیک باتیں کر رہا ہے پھر بھی اس نے احتیاطاً حمید کو (یہی اس نوجوان نے اپنا نام بتایا تھا) تفصیل سے ہدایتیں دیں، کھارے بی بی سی آئی لوکل لے کر داور جانا، داور سے جی آئی پی لوکل پکڑ کر سیدھے کلیان چلے جانا ایسی ٹرین پکڑنا جو سیدھی کلیان جاتی ہو تھانے اسٹیشن پر نہ رک جاتی ہو۔

''سب معلوم ہے''اس نوجوان نے سر ہلا کر کہا''اب مجھے سب یاد آ رہا ہے''

وہ نوجوان شریف سے رخصت ہو کر داور کے بجائے راستے میں ہی ماہم اتر گیا اور اسٹیشن سے باہر نکل کر مختلف بلڈنگوں اور چالوں سے ہوتا ہوا اپنی کھولی میں پہنچا، جہاں اس کی ماں بڑی پریشانی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی ماں غصے سے بولی''ارے حمید ے،تو اب تک کہاں تھا؟ دیکھ کتنی رات ہوگئی ہے۔''

حمید بولا:''میں کیا کرتا ماں مجھے ایک آدمی نے پکڑ لیا تھا کسی چھوڑتا ہی نہیں تھا کبھی جوس پلاتا،کبھی انگور کھلاتا کبھی اپنے بستر پر سو جانے کے لیے کہتا چلتے چلتے مجھے بیس روپے بھی دے گیا۔عجیب پاگل سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔''

اتنا کہہ کر حمید نے بیس روپے جیب سے نکال کر اپنی ماں کو دیئے اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

☆☆☆☆☆

پالکی

تھانے دار نیاز احمد میرے پتا جی کا بہت دوست تھا۔ دیکھنے میں وہ میرے پتا جی سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ میرے پتا جی کی شکل وصورت بڑی اچھی تھی۔ ان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور رنگ گندمی اور سانولے کے درمیان تھا۔

وہ ہر ایک سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتے تھے اور جس سے بات کرتے تھے اس کا دل موہ لیتے تھے۔

مگر تھانے دار نیاز احمد کی بات اور ہی تھی وہ کچھ اس طرح کا خوبصورت تھا جیسے لوگ تصویروں میں خوبصورت ہوتے ہیں۔ اونچا پورا قد، چھ فٹ تین انچ کا جوان تھا۔ پتلی کمر، چوڑا چکلا سینہ، دانت سفید اور متناسب، چھوٹی چھوٹی بل کھاتی ہوئی مونچھیں، چوڑی پیشانی پر کسی پرانے زخم کا داغ، جو اس کی سپید پیشانی پر ایک مستقل تیوری کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

چنانچہ جب وہ مسکراتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی مسکرا رہا ہے اس کی یہ ادا عورتوں و بہت پسند تھی۔

تھانے دار نیاز احمد اکثر دورے پر رہتا مگر جب دورے سے واپس آتا تو میرے پتا جی کو ہر روز شام کو ملتا۔ ان دنوں میرے پتا جی بہت رات گئے نیچے گھر میں آتے۔

اوپر ہی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں جو اکثر خالی نہ ہوتا تھا تو خالی کرا لیا تھا۔ میرے پتا جی اور تھانے دار نیاز احمد کی بیٹھک جمتی تھی کیونکہ گھر میں ماں جی کا حکم

چلتا تھا۔

گھر میں شراب پینے اور گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور میرے والد دونوں ہی چیزوں سے کبھی کبھی شوق فرماتے تھے۔

تھانیدار نیاز احمد جب دورے سے واپس آجاتا تو ان کے دونوں شوق پورے ہو جاتے دونوں دوست اسپیشل وارڈ میں بیٹھ کر خود مرغ بھونتے۔

طرح طرح کے مسالے گوشت میں ڈال کر تجربے کرتے، گاتے، بہت رات گئے تک ان کے قہقہوں کی آوازیں باغ میں آتیں۔

میری ماں کا چہرہ اس روز اڑا اڑا سا رہتا اور وہ دیر تک برآمدے کے چوبی ستون سے لگی عشق پیچاں کی بیل کے قریب کھڑی میرے پتاجی کا انتظار کرتیں۔

رات کے کوئی گیارہ بجے اور کبھی ایک بجے کے قریب میرے پتاجی باغ کی نیلے نیلے ٹائیلوں والی روش پر جھومتے جھومتے گھر آتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کے لبوں پر یہ گیت ہوتا۔

''پھٹی جب کان اس بن میں''

میری ماں کو اس گیت سے چڑ تھی۔ گیت کیا تھا، بس یہی ایک مصرع تھا جو میرے والد شراب کے نشے میں اور شراب کے نشے کے بغیر بھی موج میں آکر گایا کرتے تھے۔

''پھٹی جب کان اس بن میں''

اور میری ماں جھلا کر پوچھتیں

''آخر اس گیت کا مطلب کیا ہے؟ جب دیکھو اسے گا رہے ہو۔۔۔۔۔۔''

''بھلی مانس!''

میرے پتا اسکول کے ماسٹر کی طرح ایک انگلی اٹھا کر کہتے

''اس گیت کا مطلب ہے، پھٹی جب کان اس بن میں یعنی جب کان اس بن میں پھٹ گئی، پھٹ گئی، کان نہیں جانتی ہو؟''

کان یعنی لوہے کی کان، نمک کی کان، پتھر کے کوئلے کی کان! کوئی بھی کان ہو جس کو بارود بھر کر اڑایا جاتا ہے

کان سے مراد یہ تمہارا کان نہیں ہے جس میں یہ سونے کی بالیاں جھمک رہی ہیں بھگوان کی سوگند جانکی، آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہ رنگ و روپ تم کہاں سے لائیں، تمہاری ماں تو بڑی بدصورت تھیں

''وہ کہاں بدصورت تھیں؟''

میری ماں غصے سے چڑ کر کہتیں

''وہ تو خوبصورت تھیں، کچھ بھی ہو تمہاری ماں سے اچھی تھیں! اے کاکا! تم یہاں کھڑے کیا سن رہے ہو؟''

تم سے دس بار کہا ہے جاؤ۔۔۔۔ بھاگو۔۔۔۔۔۔سو

''یہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔''

میرے پتا میری طرف دیکھ کر میرے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتے۔۔۔۔

''باپ بارہ بجے تک شراب پیے گا تو بیٹا کیسے سوئے گا؟''

میری ماں غصے سے بھڑک اصل مطلب پر آ جاتیں وہ لڑنا چاہتی تھیں باپ

طرح دینا چاہتے تھے۔

نیاز احمد سے ملاقات کے بعد ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا مگر اس لڑائی سے پہلے مجھے سونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا پھر دونوں میاں بیوی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر لڑا کرتے تھے بہت اچھی لڑائی ہوتی تھی۔

کیونکہ میرے والد پی کر بے حد شگفتہ ہو جاتے تھے اور بڑی جی داری سے میری ماں کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔

ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے، بہت دور ڈھلوانوں سے پرے ندی کا پانی چاندی کی طرح چمکتا اور عشق پیچاں کے پھولوں کی مہک سے برآمدہ معطر ہوتا۔ اس لیے نتھری نتھری سی پاکیزہ فضا میں لڑائی بھی بہت ستھری اور سلیقے سے ہوتی تھی۔

شطرنج کے کھیل کی طرح اس لڑائی کے اصول بھی تھے ماں پہلے اونچا بولتی تھیں میرے والد دبتے تھے، پھر بیچ میں میرے والد اونچا بولنے لگتے تھے

آخر میں میری ماں روہانسی ہو جاتی اور دھیرے دھیرے سسکنے لگتیں یہ ایک سگنل تھا کہ اب صلح ہوگی اس کے بعد میرے پتا آرام کرسی سے اٹھ کر آتے اور بڑے پیار سے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر بے حد لجاجت سے معافی مانگنے لگتے۔

اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھتا۔ خوشی سے لحاف میں دبک کر سو جاتا جتنے دن نیاز احمد سے صحبت رہتی، یہی کچھ ہوتا تھا۔

نیاز احمد کی پہلی بیوی مر چکی تھی، لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی پہلی شادی سے ایک لڑکا تھا جو بڑے شہر میں پڑھتا تھا۔

نیاز احمد کی عمر پینتیس برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن دیکھنے میں وہ مشکل سے پچیس برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑا اکسرتی نوجوان تھا اور جب صبح سویرے اپنے قلعے نما تھانے کی سیڑھیاں اتر کر گھوڑا دوڑا تا ندی کے کنارے جاتا اور لنگوٹ باندھ کر کسرت کرتا تو صبح کی لطیف سنہری دھوپ میں اس کا گورا بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور سر پر گھڑے رکھے راہ چلتی عورتیں اسے کنکھیوں دیکھتی جاتیں۔ گھبرا کر نظر جھکا لیتیں۔ پھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتیں۔ پھر گھبرا کر نظر جھکا لیتیں اور ایک گہری آہ بھر کر اپنی راہ چلی جاتیں۔

نیاز احمد کو یہ معلوم تھا کہ اس پر ایک ہزار ایک شادی شدہ عورتیں مرتی ہیں اچھے اچھے خاندان والے گھروں سے اس کے لیے شادی کے پیغام آتے تھے مگر وہ شادی نہ کرتا تھا۔

کیوں نہیں کرتا تھا یہ بھی ایک راز تھا جس کا علم صرف میرے پتا کو تھا

کچھ عرصے سے نیاز احمد کے معمول میں تبدیلی آ چکی تھی پہلے تو وہ لمبے دورے کیا کرتا تھا اور مہینے میں صرف چار روز کے لیے واپس صدر مقام پر آتا تھا

اس لیے چار چھ روز کی بری صحبت تو میری ماں میرے پتا جی کے لیے رو پیٹ کر گوارا کر لیتی تھی لیکن ایک سال سے نیاز احمد کے دورے کم ہوتے جا رہے تھے۔

پہلے وہ مہینے میں صرف چار چھ روز کے لیے آتا تھا پھر آٹھ دس روز کے لیے آنے لگا تھا۔ پھر بارہ پندرہ روز کے لیے پھر بیس روز کے لیے قیام کرنے لگا۔

اب گزشتہ چار ماہ میں وہ ایک بار بھی دورہ پر نہیں گیا۔ یہ میری ماں کے لیے

بڑی مصیبت کا وقت تھا۔

پھر ایک روز رات میں بڑی بھگدڑ مچی فوج نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کر لیا نہ صرف ہمارے بنگلے کا بلکہ جہاں جہاں دوسرے افسر لوگ رہتے تھے۔

ان سب کے بنگلے فوج کے گھیرے میں لے لیے گئے اور ان سے سب کے گھروں میں تلاشی لی جانے لگی۔

سارے صدر مقام میں جگہ جگہ مشعلیں روشن جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور لوگ گھبرا کر ادھر ادھر جا رہے تھے۔ پولیس کے دستے گشت کر رہے تھے اور مختلف مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کی راجا جی نے تھانیدار نیاز احمد کی گرفتاری کا احکام جاری کیے ہیں اور انعام بھی رکھا ہے۔

جو کوئی راجا جی کے سامنے نیاز احمد کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا اسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

اسی سلسلے میں وزیر سے لے کر ڈاکٹر تک ہر بڑے افسر کے مکان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ کیونکہ تھانیدار نیاز احمد آفیسروں میں بہت مقبول تھا۔

پولیس نے راتوں رات تمام بنگلے، چپا چپا چھان ڈالا۔ مگر نیاز احمد کا کہیں پتہ نہ چلا۔

پولیس کے چلے جانے کے بعد دیر تک میری ماں اور باپ بستروں میں پڑے کھسر پسر کرتے رہے۔ ان کے خیال کے مطابق میں سو رہا تھا۔

پھر بھی معاملہ اس قدر اہم تھا کہ وہ لوگ بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے

تھے۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ تھانیدار نیاز احمد ہمارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔

میری ماں نے اسے پوجا کے کمرے میں رام اور سیتا کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا تھا۔

فوج کے لوگوں نے گو پوجا کا کمرہ بھی کھلوا کے دیکھا مگر وہ کمرے کے اندر نہ گھسے صرف دروازے سے اندر جھانک کر ہی چلے گئے۔

کیونکہ وہ پوجا کا کمرہ تھا

اور وہ لوگ میری ماں کے سخت مزاج سے واقف تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری ماں اپنے دھرم کے اصولوں کی پابندی سختی سے کرتی ہیں۔

چنانچہ انہیں اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ میری ماں ایک مسلمان کو اپنے پوجا کے کمرے میں گھسنے دیں گی اور اپنے مقدس اشٹ دیو کی مورتی کے پیچھے چھپا دیں گی!

اور میری ماں واقعی ایسا کبھی نہ کرتیں اگر میرے پتا جی لڑ جھگڑ کر انہیں اس بات کے لیے مجبور نہ کر دیتے۔

میرے باپ نے غصے میں آ کر ندی میں ڈوب مرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس پر میری ماں راضی ہو گئیں۔ مگر فوج کے چلے جانے کے بعد وہ پر دھیرے دھیرے میرے باپ سے جھگڑنے لگیں۔

''میں تم سے کہتی ہوں اس کا انجام اچھا نہ ہوگا اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''اور وہ بے چارہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اس کا خیال کچھ نہیں ہے''

''وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا کیوں اس نے ایسا کیا تھا؟''

''اس نے کہاں کچھ کیا تھا جب راجا کی بہن ہی اس پر عاشق ہو گئی، تو وہ کیا کرتا؟''

''کیا کرتا؟''

میری ماں غصہ سے بولیں

''اسے منع کر دیتا راجا راجا ہے ملازم ملازم ہے پھر وہ ہندو، وہ مسلمان اس کا پری نام کچھ اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔''

اس سے دونوں کا دھرم بھرشٹ ہوتا!

''محبت دھرم نہیں دیکھتی''

''تم ناستک ہو میں سمجھتی تھی تم آریا سماجی ہو تم ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ نہ دو گے مگر تم تو آریا سماجی سے بھی گئے گزرے۔ تم تو ٹھیٹ ناستک ہو!''

''دوستی بھی تو کوئی چیز ہے''

''اور دھرم کوئی چیز نہیں ہے اپنے مذہب کا تمہیں کوئی خیال نہیں ہے اس کی یہ ہمت کہ تمہارے راجا کی بہن سے پیار کرنے چلا ہے اور تمہاری یہ غیر کہ گھر میں پناہ دے رہے ہو''

''جانکی''

میرے باپ نے اپنے بستر سے جھک کر زور سے میری ماں کی بانہہ پکڑ لی اور انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی ہو دوستی بھی ایک دھرم ہے وہ خود ایک مذہب ہے اس کے اپنے

اصول ہیں جس طرح تمہارے دھرم کے اصول ہیں''

میری ماں نے اپنی بانہہ چھڑاتے ہوئے کہا

ہوں گے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے دھرم کے اصولوں کو میرے دھرم کے اصولوں پر لادو

''میں جس مندر میں تمہیں اشنان کیے بغیر نہیں جانے دیتی تھی میں نے اسی مندر میں تمہارے مسلمان دوست کو چھپالیا ہے''

نہ جانے بھگوان مجھے اس کی کیا سزا دیں گے؟ کیونکہ میں نے ان کا مندر بھرشٹ کر دیا ہے زندگی میں جا کام کرنے میں کبھی نہیں کیا تھا وہ بھی تم نے مجھ سے کروالیا۔۔۔

میری ماں رونے لگی

پتا جی نے اسے دلاسا دینے لگے

''چند دن کی بات ہے اس کے بعد جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پولیس کی دوڑ دھوپ کم ہو جائے گی تو وہ خود ہی ہمارا گھر چھوڑ دے گا اور اس علاقے سے بھاگ جائے گا۔''

یہاں تو اسے جان کا خطرہ ہے

''اس کی جان ہی کو نہیں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔ یہ مت بھولو کہ تم بھی راجا جی کے ملازم ہو اور ملازم ہوتے ہوئے در پردہ ان سے غداری کر رہے ہو''

میں اب تم سے زیادہ نہیں کہتی صرف اتنا کہتی ہوں کہ اپنے دوست سے کہہ دو کہ وہ سنکرانت سے پہلے یہاں سے اپنا منہ کالا کر جائے۔

سنکرات کے دن میں اس مندر کو اپنے ہاتھوں سے گنگا جل سے دھو کر صاف کروں گی اور مشر جی کو بلا کر اکیس دن کی کتھا رکھوں گی ۔

یگ کروں گی، ہون کروں گی، پراشچت کا بھوک اکیس براہمنوں کو کھلاؤں گی جب جا کے کہیں میرے دل کو چین آئے گا۔

''دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی'' میرے پتا جی نے گھبرا کر کہا آہستہ بولو'' کہیں وہ سن نہ لے''

''سن لے تو اچھا ہے!''

ماں اور بھی جھلا کے بلند آواز میں بولیں

شش کہہ کر میرے پتا نے میری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

ساتھ والے جس کمرے میں نیاز احمد کو چھپایا گیا تھا۔ اس میں پھر ذرا سی آہٹ ہوئی پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ روشندان ذرا کھلا تھا۔۔۔۔

پتا جی نے ماں سے کہا

''کل صبح اس روشن دان کے شیشے پر سیاہی پھیر کر اسے بھی بند کرا دینا''

''بہت اچھا''

میری ماں نے سرگوشی میں کہا

پھر وہ سونے سے پہلے منہ ہی منہ میں جاپ کرنے لگیں یہ ان کا روز کا دستور تھا!

دوسرے دن صبح کے وقت میری ماں سب سے پہلے اٹھیں۔ ابھی نوکر سوئے پڑے تھے کہ انہوں نے نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتے کا سامان تیار کرلیا اور سب چیزیں ایک ٹرے میں سجا کر پوجا کے کمرے میں لے گئیں۔ مگر فوراً ہی لوٹ آئیں انہوں نے جلدی جلدی بیڈ روم میں جا کر میرے والد کو جگایا اور ان سے کچھ کہا۔

دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں میرے والد گھبرا کر بستر سے اٹھے اور پائجامے کا ازار بند اڑستے ہوئے بولے

''کدھر؟ کہاں؟ کیسے؟''

میری ماں آہستہ سے بولیں

''تم خود چل کر دیکھ لو''

پتا جی بھاگے بھاگے پوجا کے کمرے میں گئے مگر وہاں نیاز احمد نہ تھا۔ کمرے کے عقب میں ایک کھڑکی کھلی تھی وہ رات کی تاریکی میں کھڑکی کھول کر کہیں فرار ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

اسی دن صبح کو آٹھ کے قریب قلعہ نما تھانے کی سیڑھیوں کے نیچے کچی سڑک کے کنارے اس کی لاش پائی گئی۔ کسی نے اسے مار اس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے اور کوئی اسے زندہ یا مردہ لانے کا انعام لینے بھی نہ آیا تھا۔

جس وقت میرے پتا جی نہا دھو کر ناشتہ کرنے لگے۔ ہسپتال کے اردلی نے اطلاع دی کہ تھانے دار نیاز احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لاش گھر آ چکی ہے۔ پتا جی نے گھور کر غضب ناک نظروں سے میری ماں کی طرف دیکھا اور میری

ماں نے خائف اور پشیمان ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

پتا جی ناشتہ کیے بغیر کمرے سے نکل گئے اور ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

اور وہ کرسی پر جھک کر رونے لگیں

میرے پتا جی نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک میری ماں سے بات تک نہیں کی۔

پھر سنکرانت آ گئی اور میں حسب سابق ست ناجے میں تلا میری کوری دھوتی مشر جی کو دے دی گئی اور ماں مجھے گوردوارے لے گئیں۔

گوردوارے کے باہر والے مندر میں ہم نے گھنٹے بجائے اور پھر ہم وہاں سے مراد کے مزار کی طرف چل دیئے۔

لیکن آج میری ماں بہت اداس تھیں

اور تھوڑے وقفے کے بعد نہ جانے کیا خیال کر کے آب دیدہ ہو جاتیں۔ جب ہم ڈھکی اتر کر شاہ مراد کے مزار کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مزار کے قریب کی سنسان پگڈنڈی پر شاہی محل کی ایک پالکی رکھی ہے اور اس کے گرد چار کہار کھڑے ہیں

میری ماں شاہی ڈولی دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئیں اور مجھے لے کر ایک درخت کی اوٹ میں گئیں اور دیر تک چپ چاپ کھڑی رہیں

انہوں نے چپکے سے کہا

''تو بچہ ہے تجھے شاہی محل کے کہار جانے دیں گے جا کے دیکھ تو سہی مزار پر کیا

ہو رہا ہے؟''

میں ان کی اجازت لیتے ہی بگ ٹٹ دوڑ اور پاؤں سے کنکر اڑاتا پتھروں کو ٹھوکریں مارتا ہوا مزار کی طرف بڑھ گیا۔

جدھر گھنی بیریوں کا جھاڑ تھا

کہاروں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا

لیکن جرے نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور دیکھتے ہیں اشارے سے وہیں رک جانے کو کہا۔

میں ایک جھاڑی کے قریب رک گیا بلکہ دبک کر چھپ گیا

میں نے سمجھا یہ بھی جرے کا کوئی نیا کھیل ہے جرا میرے پاس آ کر آہستہ سے بولا

''مزار پر کوئی نہیں جا سکتا اس وقت!''

''کیوں؟''

میں نے دھیرے سے پوچھا

جرے نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا

صرف اتنا کہا

''میں تم کو لے چلوں گا''

''کیسے؟''

میں نے پھر پوچھا

مگر جرے نے پھر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سنتھے کی

جھاڑیوں کے پیچھے سے گھٹنوں کے بل چل کر کہیں مڑ کر، کہیں دبک کر بیریوں کے جھنڈ کے اندر لے آیا۔

وہاں ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے اور بیریوں کی شاخیں ہٹا کر دیکھنے لگے

چاچا رمضانی مزار کے قریب بیٹھے تھے ان کے سامنے سفید برقعے میں ایک عورت کھڑی تھی۔

''شاہی محل کی رانی ہوگی''

میں نے آہستہ سے کہا

اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

کیونکہ عام طور پر مسلمان عورتیں برقع پہنتی ہیں اور وہ بھی کالا ہوتا ہے سفید برقع صرف ہندو عورتیں پہنتی ہیں جو چاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ہیں

چاچا رمضانی کی گھگی بندھی ہوئی تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سفید برقع والی عورت کو دیکھ رہا تھا۔

اور اس کا تسبیح والا ہاتھ کانپ رہا تھا

برقعے والی عورت نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا

''تم میری آمد کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے''

رمضانی نے نفی میں سر ہلایا

''اور تم سب نذر و نیاز دو گے''

''اور تم قبر پر روز دیا جلاؤ گے پھول چڑھاؤ گے اور وہ سب کام کرو گے جو اس سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔''

رمضانی نے پھر اثبات میں سر ہلایا

سفید برقعے والی عورت دیر تک برقع کے اندر سے رمضانی کو گھورتی رہی۔

اس کے بعد برقعے کے ایک کونے سے دو تین پتلی پتلی نازک سی مخروطی انگلیاں پل بھر کے لیے باہر نکلیں پھر برقعے میں چھپ گئیں اور سو سو کے کئی نوٹ رمضانی کی جھولی میں گر پڑے۔

رمضانی جلدی جلدی تسبیح پھیرنے لگا

''قبر کہاں ہے؟''

اس عورت نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا

چاچا رمضانی آنکھ کے ایک کونے سے صرف اشارہ ہی کر سکا۔ مگر عورت نے سب سمجھ لیا اور وہ بڑے مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی مزار کی سیڑھیاں اتر کر قبرستان میں چلی گئی۔

اب میں اور رجرا بھی منہ موڑ کر قبرستان کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ عورت ایک قبر کے پاس جا کر رک گئی اور دیر تک وہیں خاموش کھڑی رہی پھر یکایک اس پر گر پڑی اور اس کے دونوں ہاتھ قبر پر پھیل گئے

اور ان ہاتھوں کی انگلیاں قبر پر اس طرح تڑپنے لگیں، جس طرح بہت ہی پتلے پانی میں مچھلیاں تڑپتی ہیں پھر وہ انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

اور یکایک بیریوں میں گہرا سناٹا چھا گیا مزار پر اندھیرا سا ہو گیا

اور چاچا رمضانی کی تسبیح کے دانے کانپنے لگے اور میں اور رجرا حیرت سے اور خوف سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے

ایک لمبے سکوت کے بعد وہ عورت وہاں سے اٹھی لیکن اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سفید براق برقع بھوری مٹی سے اٹا ہوا تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہانپتی کانپتی جھاڑیوں اور چٹانوں سے الجھتی ہوئی مزار کے اوپر کی پگڈنڈی پر پہنچ گئی اور کسی سے کچھ کہے بغیر پالکی میں بیٹھ گئی

کہاروں نے پالکی کا پردہ گرا دیا

اور اسے اٹھا کر چل دیئے! اور چند لمحوں میں ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

پالنا

میرے ہاتھ میں ایک عینک ہے لوگ اسے عینک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں یہ صرف کانچ کے ٹکڑے ہیں جو پلاسٹک کی کمانی میں اس طرح پھنسا دیئے گئے ہیں جس طرح سماج کی کمانی میں انسان کی زندگی پھنسادی جاتی ہے یہ زندگی ٹوٹ سکتی ہے مگر اس کمانی سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہی حال ان کانچ کے دوٹکڑوں کا ہے۔

مگر پلاسٹک کی کمانی میں پھنسے ہوئے کانچ کے یہ دوٹکڑے معمولی بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جب میں انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتا ہوں تو میری آنکھوں کو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے، وہ سب کچھ جو اس سے پہلے نظر نہ آتا تھا۔ یا موہوم، مبہم اور پر اسرار دکھائی دیتا تھا پھیلا پھیلا، دھندلکوں میں لپٹا ہوا، عینک لگانے پر سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے جیسے دھند چھٹ گئی ہو، غبار دھل گیا ہو اور ہر چیز فوکس میں ہو میرے خیال میں کانچ کے ٹکڑوں کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو یہ فائدہ ضرور ہے کہ یہ ٹکڑے انسانوں کی آنکھوں کو ٹھیک کر دیتے ہیں یوں تو ہر انسان۔۔۔۔آنکھیں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا نگاہ ہوتے ہوئے بھی اندھا رہتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اس کے چاروں طرف اونچی دیواریں ہوں اور بیچ میں اندھیرا ہو؟

مگر یہ کانچ کے ٹکڑے بڑے عجیب ہیں یہ دیواروں کے آرپار دیکھ لیتے ہیں جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں روشنی کر دیتے ہیں یہ چاہیں تو وقت تھم جائے آگے

بہنے لگے یا پیچھے چلنے لگے۔ جب نظر ان ٹکڑوں میں سے گزرتی ہے تو روشنی سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے وہ کبھی تو ساری کائنات کا احاطہ کرلیتی ہے اور کبھی ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

میں ہر روز صبح کو اخبار کانچ کے انہی ٹکڑوں کی مدد سے پڑھتا ہوں مگر ان کا برتاؤ میری آنکھوں سے عجیب سا ہوتا ہے مثلاً میں آج صبح کے اخبار میں پردھان منتری کی تقریر پڑھنا چاہتا تھا مگر کانچ کے ٹکڑے شاید کچھ اور پڑھنا چاہتے تھے میں نے جوں ہی پردھان منتری کی تقریر پڑھنی شروع کی میری نظر کے نیچے سے اخبار کے الفاظ پھسلنے لگے پگھل کر اپنی شکل کھونے لگے اور بڑے بڑے دائرے بن کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے میں نے پریشان ہو کر وہاں سے نظر ہٹا لی سوچا چلو پردھان منتری کی تقریر نہ سہی کوئی دوسری خبر ہی پڑھیں گے ذرا معلوم تو کریں افریقہ میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ جاننے کے لیے میں نے اخبار کا صفحہ پلٹا تو میری نگاہ پھسلتے پھسلتے، افریقہ کی خبر سے بھی ایک تصویر پر آکر رک گئی، اور کانچ کے ٹکڑے فوکس میں آگئے یہ افریقہ کے کسی بڑے نیتا کی تصویر نہ تھی یہ دریا گنج کے ایک یتیم خانہ کی تصویر تھی جس کے باہر ایک پالنا لٹکا ہوا تھا تاکہ لوگ حرامی بچوں کو کسی گندی موری میں ڈالنے یا کوڑے کرکٹ کے کسی ڈھیر میں پھینکنے کی بجائے اس پالنے میں رکھ جائیں! کس قدر عمدہ اور نیک خیال آیا تھا کسی کو! جس کسی نے یہ ترکیب نکالی اس کے ذہن رسا کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا میں نے ایک پلک جھپکا کر بڑے غور سے اس پالنے کی طرف دیکھا اور پلک جھپکتے ہی میں وہاں موجود تھا۔ پکے رنگ کی ایک عورت اس پالنے میں اپنا بچہ رکھ کر اور گھنٹی بجا کر جلدی سے

واپس جا رہی تھی۔

''ارے ارے ٹھہرو!''

میں نے اسے چلا کر کہا مگر تیزی سے دوڑی اور نکڑ پر جا کر غائب ہو گئی میں نے پالنے میں پڑے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے میں اس عورت کی طرف دوڑا اور دوسری گلی کے آخر پر اسے جالیا وہ ہانپتی کانپتی ایک ڈرگ سٹور کے خالی برآمدے میں بیٹھ گئی مجھے قریب آتے دیکھ کر اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا میں اس کے قریب آتے ہوئے کہا

''تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنا بچہ اس پالنے میں چھوڑ آئی ہو''

مگر بالکل قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اس پر یوں سوال کرنا ٹھیک نہ تھا کیوں کہ وہ عمر کے اسے حصے سے گزر چکی تھی جس میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ بے حد گھبرا چکی تھی اس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پر سر رکھ دیا

''کس کا بچہ ہے؟''

میں نے کڑک کر پوچھا

''میری بیٹی کا''

وہ روتے ہوئے بولی

''کہاں رہتی ہو؟''

''سرکی والاں کی گلی میں''

''بچے کو واپس لے جاؤ''

"نہیں لے جاسکتی" بوڑھی عورت نے روتے روتے اپنا سر اٹھالیا۔

"ابھی تو اپنی بیٹی کو بھی محلے میں واپس نہیں لے جاسکتی لوگ کیا کہیں گے اور برادری کیا کہے گی! میری بیٹی کنواری ہے اس کے باپ کو تو بچہ پیدا ہونے کا علم ہی نہیں ہے اسے معلوم ہو گیا تو میری بیٹی کو جان سے مار ڈالے گا"

" اور وہ بدمعاش کہاں ہے؟ جس نے۔۔۔۔۔جس نے۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

"اس نے اپنا تبادلہ دہلی سے باہر کرالیا ہے پہلے تو کہتا تھا کہ شادی کرلوں گا پھر چپکے سے تبادلہ کرا کے مدراس چلا گیا"

"تو اسے مدراس میں جا کر پکڑلو اس پر مقدمہ کردو؟"

"کتنی بدنامی ہوگی بیٹا؟ سارے خاندان میں ناک کٹ جائے گی ذرا سوچو میری بیٹی کنواری ہے ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں میں کسی دوسری جگہ اس کی شادی کر سکتی ہوں!"

میں اس بوڑھی عورت کے پاس بیٹھ گیا اور اسے بڑے میٹھے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ذرا سوچو تو ماں! تم اس بچے کی نانی ہو نانی! وہ تمہارا نواسہ ہے زندگی بھر شاید تم نے نواسے کو گود میں کھلانے کا خواب دیکھا ہوگا اور آج تم اسے یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ آئی ہو ذرا سوچو تو ماں، تم اس بچے کو واپس لے جاؤ۔ اسے ماں کا پیار دو، نانی کا لاڈ اور چاؤ دو اسے بھی تمہارے گھر میں جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہاری بیٹی کو ہے۔ رہا تمہاری بیٹی کی شادی کا سوال، سو، ہمارا دیش اب جاگ اٹھا

ہے آج تمہیں ہزاروں روشن خیال نوجوان ایسے مل جائیں گے جو تمہاری بیٹی کی دردناک داستان سے متاثر ہوکر اس سے شادی کے لیے تیار ہو جائیں گے۔''

بڑی اچھی تقریر تھی اس وقت میں خود بھی اس تقریر سے اس قدر متاثر ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری تقریر سن کر اس بوڑھی عورت کے چہرے پر بھی رونق اور اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک آ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور میری طرف خوشی اور امید سے دیکھتے ہوئے بولی

''بیٹا! کیا تم۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ میری بچی سے شادی کر لوگے؟''

''میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔؟'' میں ایک دم گھبرا گیا میری بات تو اور ہے میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔ میری شادی ہو چکی ہے! میں نے جھوٹ بول دیا وہ بوڑھی عورت میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنے سامنے کسی دوسرے حرامی بچے کو دیکھ رہی ہو۔ وہ بہت دیر تک چپ چاپ دیکھتی رہی پھر جب میں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں تو اس نے ایک آہ بھر کر ''ہائے رام'' کہا اور وہ اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے سہارے دے کر اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر چپ چاپ وہاں سے چل دی۔

میں پالنے کی طرف لوٹ آیا اور ایک ایسے کونے میں بیٹھ گیا۔ جہاں سے میں پالنے کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن کوئی دوسرا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس بڑھیا کے سوال پر بڑا غصہ آیا تھا۔ اونہہ! گناہ کوئی کرے اور سزا میں بھگتوں، عیش کرے دوسرا اور قیمت چکاؤں میں؟ ایسا احمق نہیں ہوں میں! پھر صاحب یہ کہاں کی تک ہے کہ جو کوئی اچھی تجویز سمجھائے اسی کے پلے تجویز باندھ دی جائے میرا کہنے کا

مطلب تو صرف یہ تھا کہ اس ملک میں سینکڑوں ہزاروں ایسے روشن خیال نوجوان ہوں گے جو۔۔۔۔۔۔جو۔۔۔۔میرا مطلب یہ نہیں کہ میں روشن خیال نہیں ہوں مگر بھئی اب میں نے اپنے ذہن میں اپنی ہونے والی بیوی کی جو تصویر بنا رکھی ہے وہ اس لڑکی سے قطعی مختلف ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ میں ابھی شادی بھی نہیں کرنا چاہتا کوئی زبردستی ہے؟

لیکن مجھے ان عورتوں پر غصہ آ رہا تھا جو ماں بن کر اپنی مامتا کو بھول جاتی ہیں اور اپنے ننھے بچے کو ایک یتیم خانے کے پالنے میں چھوڑ جاتی ہیں میں نے سوچا آج میں دن بھر اس پالنے کی نگرانی کروں گا اور میں دن بھر ایک عورت کو بھی شرم دلا کے مجبور کر سکا کہ وہ اپنے بچے کو واپس لے جائے تو میرا دن ضائع نہ جائے گا۔

لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک نوجوان لڑکی آئی اور گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک پارسل سا پالنے میں پھینک کر چلی گئی یکا یک پارسل رونے لگا میں اس لڑکی کے پیچھے دوڑا وہ لڑکی مجھے دیکھ کر بھاگی اور گلی کے نکڑ پر ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی آخر دو چار گلیوں سے گھومتی گھامتی وہ سامنے سے پلٹ کر پچھواڑے کی اس سڑک پر آئی جو دریا گنج میں شہر کی پرانی فصیل کے کنارے چلتی ہے۔وہ بار بار مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی تھی اور میں اس کے پچاس گز کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے اس طرح چل رہا تھا جیسے میں اس کا پیچھا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ چہل قدمی کی غرض سے اپنے گھر سے نکلا ہوں۔

دریا گنج سے باہر نکل کر وہ لڑکی فصیل کے باہر دیوار کے ایک کونے سے لگ کر

کھڑی ہوگئی اس کے سامنے آصف علی مرحوم کا بت تھا نمائش ہو رہی تھی اس لڑکی کے بالکل قریب بائیں طرف ایک گہری کھائی تھی، دائیں طرف ایک فلم کا بہت بڑا اشتہار لگا ہوا تھا ''دل اپنا، پریت پرائی'' میں بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا وہ منہ پھیرے کھڑی تھی ''ہیلو!'' میں نے آہستہ سے پوچھا ''پریت پرائی کا نتیجہ کیا نکلا؟'' وہ یکا یک میری طرف گھومی اور مجھے شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی ''اگر تم نے پیچھا کیا تو میں پولیس سے شکایت کر دوں گی۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو، اور میری شکایت کرا دو اور میں اس لڑکی کی شکایت کر دوں جو ابھی ابھی اپنا بچہ یتیم خانے کے پالنے میں رکھ کر آئی ہے۔''

''یہ سراسر جھوٹ ہے اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟''

''ثبوت تو ڈاکٹر دیں گے''

میں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھتے ہوئے کہا

اس کی شرربار نگاہیں بجھ سی گئیں، جیسے بجلی کا سوئچ ایک دم آف ہو جائے اس کے خوبصورت سے چہرے پر اندھیرا سا چھا گیا اس کے پتلے پتلے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ دھیرے دھیرے سے پوچھنے لگی۔

''تم کتنا روپیہ چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔؟''

میں نے پوچھا ''تم کتنا دے سکتی ہو؟''

ہمارے سامنے سے پولیس کا سنتری ہمیں گھورتے ہوئے گزر گیا، وہ بے حد

گھبرا گئی، بولی:

''چلو موٹر میں چل کر بیٹھو، وہاں بات کریں گے۔''

تم! تو تم موٹر میں آئی ہو؟ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ساتھ ہولیا اور ہم دونوں سامنے کا چھوٹا سا پارک کراس کرنے لگے جس میں آصف علی مرحوم کا بت تھا۔ جب میں اس کے ساتھ چل رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ اونچے پورے قد کی لڑکی ہے اور اس کی کمر بڑی دلکشی کے ساتھ لچکتی ہے، بالوں سے شونتی کے پھولوں کی مہک آتی ہے، اس کی ساڑھی کا کپڑا بے حد مہنگا ہے اس کی گاڑی کا ماڈل صرف دو سال پرانا ہے۔

ہم دونوں پارک کراس کر کے سڑک کراس کر گئے اور اس کی موٹر میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے اس لڑکی نے اندر بیٹھ کر اپنے کانوں کی بالیاں اتاریں اور پھر ہاتھ کا منقش کنگن اتارا۔ پھر اپنا پرس کھول کر اس میں سے پانچ سو روپیہ نکالا اور یہ سب کچھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا

''لو سنبھالو یہ سب، اور میری جان بخشی کرو''

''یہ تو بہت کم ہے''

میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا

''تو اور تم کیا لو گے'' مغرور اور بد مزاج لڑکی نے ذرا تیز لہجے میں مجھ سے سوال کیا

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بچے کو واپس لے جاؤ''

''ناممکن ہے میں کنواری ہوں''

''کنواری تو نہیں ہو، یوں کہو تم شادی شدہ نہیں ہو''

''اچھا یونہی سہی پھر؟''

''پھر تم اس شخص سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں جس سے تمہیں ایسی شدید محبت رہی ہے تم بے حد حسین ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تم سے شادی کیوں نہیں کرے گا''

''وہ تو کرنا چاہتا ہے مگر میں نہیں کرنا چاہتی''

وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی

''شاید اس واقعے کے بعد تمہیں اس سے نفرت پیدا ہو گئی ہے؟''

میں نے اس سے پوچھا

''نہیں مجھے اس سے شدید محبت ہے''وہ بولی

''تمہیں اس سے محبت ہے؟ میں حیران ہو کر بولا وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟''

''وہ غریب ہے اور میرا خرچ برداشت نہیں کر سکتا''

''تو تم اپنا خرچ کم کر دو!''

''یہ ناممکن ہے''وہ لڑکی بڑے فیصلہ کن لہجے میں بولی''میری سہیلیوں نے بڑے بڑے لوگوں سے شادیاں کی ہیں میں بھی ایسا ہی کروں گی میں نئی دلی میں ایک بہت بڑی ملازمت پر کام کرتی ہوں میں ایک غریب آدمی سے شادی کیوں کروں؟''

'' آئی سی میں نے سوچتے ہوئے کہا اچھا تم ایسا کرو کہ یہ بچہ جو تم دونوں کی

محبت کا ثمر ہے اس کے باپ کو دے دو مجھے یقین ہے کہ وہ اسے تمہارے پیار کی آخری نشانی سمجھ کر نہیں لوٹائے گا۔"

"میں اسے یہ بچہ نہیں دے سکتی!"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے!"

"جس سے تمہیں محبت ہے یہ اس کا بچہ نہیں ہے؟" میں حیرت سے بولا

"تو پھر کس کا بچہ ہے؟"

"میرے دوست کا بچہ ہے!"

"تو یہ بچہ تمہارا نہیں ہے؟"

"یہ بچہ تو میرا ہے مگر اس سے نہیں ہے جس سے مجھے محبت ہے اس بچے کا باپ دراصل ایک بزنس مین ہے جو میرا دوست ہے!"

"تو تم اس بزنس مین ہی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ وہ تمہارا خرچ بھی یقیناً برداشت کر لے گا اور اس غریب بچے کو اس کا باپ بھی مل جائے گا"

"نہیں میں اس بزنس مین سے شادی نہیں کر سکتی" وہ لڑکی انتہائی سکون اور طمانت سے بولی "وہ مجھے پسند نہیں ہے"

"جو تمہیں پسند ہے اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور جس کا بچہ ہے وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم شادی کرو گی تو کس سے کرو گی؟ تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے"

"خوبصورت لڑکیوں کے مسئلے بہت جلد حل ہو جاتے ہیں مسٹر! وہ ہنسی اور اس کے خوبصورت دانت چند لمحوں کے لیے اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک

لبوں میں چمک چمک گئے۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی مگر اس کی خوبصورتی نرم گرم اور گداز چیزوں کی یاد نہیں دلاتی تھی اس کی خوبصورتی دیکھ کر سخت اور چمکیلی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ جیسے بلور، سونا، موتی، خوبصورت لیکن سخت!''

اس نے میرا بازو تھپک کر کہا

''میرے لیے چنتا نہ کرو، مجھے ضرور میرے مطلب کا شوہر مل جائے گا ایسا جو میرے غریب عاشق کی طرح خوبصورت ہو میرے دوست بزنس مین کی طرح مالدار ہو اور میری پسند کا بھی ہو۔'' اس نے گاڑی کا پٹ کھولتے ہوئے کہا

''اب تم اپنا مال سنبھال لو اور گاڑی سے نیچے اتر جاؤ جلدی کرو''

میں جم کر سیٹ پر بیٹھ گیا

''اگر ایسا ہے تو تم اس گاڑی سے نیچے اتر جاؤ!''

''میں کیوں اتر جاؤں؟'' وہ حیران ہو کر بولی

''اس لیے کہ تم اگر اپنی پسند کی خاطر اپنے بچے کو قربان کر سکتی ہو تو اسی پسند کے لیے تمہیں اس گاڑی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے کیوں کہ یہ گاڑی مجھے پسند ہے، یہ گاڑی مجھے لکھ دو، ورنہ چلو تھانے۔''

''مسٹر!'' وہ لڑکی ایک دم چیخ کر بولی اور اس نے زور سے میری کلائی پکڑ لی، اس نے اپنے لمبے لمبے ناخن زور سے میری کلائی میں گاڑ دیئے اور کہا

''مسٹر میں تمہیں سب کچھ دے سکتی ہوں، مگر یہ گاڑی نہیں دے سکتی اسی گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے۔ میری سب سہیلیوں کے پاس گاڑیاں ہیں سب اپنی گاڑیوں پر اٹھلا کر چڑھتی تھیں اور بات بات میں اپنی گاڑی

کا رعب جتلاتی تھیں حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ان میں سے دو نے اپنی گاڑیاں بالکل اسی طرح حاصل کی تھیں جس طرح میں نے یہ گاڑی حاصل کی ہے سو ہاؤ کڈ آئی ٹالریٹ اٹ ISHON COULD I TOLERATEIT میں نے بھی اس بزنس مین سے دوستی کر لی۔ جو دو سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا اسی گاڑی کے لیے تو میں نے یہ بچہ پیدا کیا ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں یہ گاڑی تمہیں دے دوں؟ آر یو نٹس؟Areyounuts ''

وہ لڑکی واقعی مجھ سے بہت خفا تھی اس کا صبیح چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا اور وہ میری طرف ایسی شدید نفرت سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے اس کی کار نہیں، اس کی عصمت طلب کی ہو وہ بار بار اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا

تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا تو اس نے اپنے ناخن میری زخمی کلائی سے باہر نکال لیے اپنی پلکیں اپنے رخساروں پر گرا لیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی

''یہ گاڑی تو میں نہیں دے سکتی اور جو تم چاہو۔۔۔۔''

''اب تو میں صرف اتنا چاہتا ہوں'' میں نے جھنجھلا کر اسے کہا کہ کوئی ایسی ترکیب ہو جائے جس سے تمہاری ایسی مائیں بچے نہ جنا کریں

اگر ایسا ہو جائے تو اس دنیا سے حرامی بچوں کی پیدائش کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو جائے گا!

یہ کہہ کر میں نیچے اترا، اس کی گاڑی کا پٹ زور سے بند کر دیا اور جلدی جلدی وہاں سے چلا گیا۔

شام تک کوئی نہ آیا پالنا خالی ہی رہا رات کا اندھیرا بڑھتا گیا دل کا سناٹا گہرا ہوتا گیا گلی کے سیاہ اور پھٹے ہوئے ہونٹوں میں بجلی کے دو چار میلے اور پیلے قمقمے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جب نو کے قریب مجھے زور کی بھوک لگی تو میں نے واپس گھر چلنے کی ٹھانی اتنے میں میں نے دیکھا ایک میلے کچیلے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک منحنی سی عورت اس پالنے کے سامنے رکی دیر تک رکی رہی پھر اس نے جھک کر اپنے لبادے سے کچھ نکالا اور اس پالنے میں رکھ دیا اور پھر دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے واپس ہونے لگی سر جھکائے ہوئے میں اس کے تعاقب میں اٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ تاریک سایوں میں وہ عورت پلٹتی ہوئی دکھائی دی واپس آ کر اس نے اپنے بچے کو اٹھایا اپنے گلے سے لگایا اور واپس چل دی مگر گلی کے موڑ پر پہنچ کر وہ پلٹی اس نے واپس آ کر اپنے بچے کو پھر پالنے میں رکھ دیا اور گلی سے باہر بھاگ گئی۔

سنگھ برادرز کے موٹر مرمت کرنے والے گیراج کے عقب سے جو راستہ لال قلعے کو جاتا ہے ادھر جاتے ہوئے میں نے پیچھے سے اس کا لبادہ کھینچ لیا یکا یک میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جسے میں عورت سمجھا تھا وہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا اس کے چہرے پر ڈاڑھی کئی دن کی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں میں اس سے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تم کس کا بچہ اس پالنے میں چھوڑ آئے ہو؟''

چند لمحوں تک وہ میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر وہ میرے پاؤں پر گر گیا اور گڑ گڑا کر کہنے لگا

''مجھے معاف کر دو حوالدار صاحب!''

اس نے مجھے سی آئی ڈی کا کوئی آفیسر سمجھا ہو گا وہ گڑ گڑا کر معافی مانگ رہا تھا میں نے بھی اس کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہ سمجھا ''کس کا بچہ ہے وہ!'' میں نے اس سے پھر سختی سے پوچھا ''جلدی بتاؤ؟''

''میرا بچہ ہے؟''

''کیا حرام کا ہے؟''

''نہیں مائی باپ! میری بیوی کا بچہ ہے!''

''تیری بیوی کا بچہ ہے تو پھر تو اسے اس پالنے میں کیوں رکھ آیا؟ تیری بیوی کیسی ماں ہے؟ اس نے تجھے اس بات کی اجازت دے دی؟''

میری بیوی مر چکی ہے حضور! دس دن ہوئے وہ ایک ماہ کا بچہ چھوڑ کر مر گئی گھر میں جو تھا اس کفن دفن پر لگ گیا۔ میں چھ ماہ سے بے کار ہوں کہیں کوئی کام نہیں ملتا گھر میں پانچ بچے ہیں یہ چھٹا ایک مہینے کی ننھی سی جان کل سے بھوک سے بلک رہا تھا تین دن سے گھر کے سب لوگ فاقے سے ہیں مگر کسی نہ کسی طرح اس کے لیے دودھ ہم لاتے رہے، کل رات سے اس کے لیے دودھ بھی نہیں ملا کیسی دنیا ہے یہ مالک؟ یہاں ننھے بچے کے لیے دودھ بھی نہیں ہے تین دن سے میرے سب بچے میرے ساتھ فاقے کر رہے ہیں وہ مر جائیں گے، میں جانتا ہوں وہ مر جائیں گے۔ میں بھی مر جاؤں گا میں نے سوچا یتیم خانے کے لوگ اس کی پرورش کر سکیں گے، اس لیے ننھی سی جان کو وہاں ڈال آیا ہوں۔

''تمہیں معلوم ہے وہاں وہ کیسے رہے گا باپ ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی

بے باپ کا بیٹا کہلائے گا''

''مگر زندہ تو رہے گا حوالدار جی زندہ تو رہے گا'' اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکالیا

آدھی رات ۔۔۔۔۔۔

پالنا خالی ہے

انسان کی بھوک کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔!!

میں بہت تھک گیا ہوں اور میں نے جو کچھ آج دیکھا ہے وہ دیکھ کر واپس گھر بھی نہیں جانا چاہتا میں تھک کر اور گر کر اسی پالنے میں سو جانا چاہتا ہوں

مگر یہ پالنا بہت چھوٹا ہے۔۔۔۔۔۔اور ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔!!

☆☆☆☆☆

پانی کا درخت

جہاں ہمارا گاؤں ہے اس کے دونوں طرف پہاڑوں کے روکھے سوکھے سنگلاخی سلسلے ہیں مشرقی پہاڑیوں کا سلسلہ بالکل بے ریش وبروت ہے۔ اس کے اندر نمک کی کانیں ہیں مغربی پہاڑی سلسلے کے چہرے پر جنڈ، بھیکڑ، املتاس اور کیکر کے درخت اگے ہوئے ہیں اس کی چٹانیں سیاہ ہیں لیکن ان سیاہ چٹانوں کے اندر میٹھے پانی کے دو بڑے قیمتی چشمے ہیں، اور ان دو پہاڑی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تلہٹی پر ہمارا گاؤں آباد ہے۔

ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے یہاں کی زمین کو ہانپتے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ایسی ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے جو صدیوں کی ناآسودہ پیاس سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے گاؤں کے مکان اور آس پاس کی زمین بالکل بھوری اور خشک نظر آتی ہے زمین میں باجرے کی فصل جو ہوتی ہے اس کا رنگ بھی بھورا بلکہ سیاہی مائل ہوتا ہے یہی حال ہمارے گاؤں کے کسانوں اور ان کے کپڑوں کا ہے صرف ہمارے گاؤں کی عورت کا رنگ سنہری ہے کیونکہ وہ چشمے سے پانی لاتی ہیں۔

بچپن ہی سے میری یادیں پانی کی یادیں ہیں، پانی کا درد اور اس کا تبسم، اس کا ملنا اور کھو جانا۔ یہ سینہ اس کے فراق کی تمہید اور اس کے وصال کی تاخیر سے گودا ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو دادی اماں کے ساتھ گاؤں کی تلہٹی کے نیچے بہتی ہوئی رویل ندی کے کنارے کپڑے دھونے جایا کرتا تھا دادی اماں کپڑے دھوتی تھیں، میں انہیں سکھانے کے لیے ندی کے کنارے چمکتی ہوئی بھوری ریت پر ڈال دیا کرتا۔ اس ندی میں پانی بہت کم تھا۔ یہ بڑی دبلی پتلی ندی تھی چھوری اور آہستہ خرام جیسے ہمارے سردار پینداخان کی لڑکی بانو، مجھے اس ندی کے ساتھ کھیلنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جتنا بانو کے ساتھ کھیلنے میں دونوں کی مسکراہٹ میٹھی تھی، اور مٹھاس کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو میری طرح نمک کی کان میں کام کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ہماری رویل ندی سال میں صرف چھ مہینے بہتی تھی، چھ مہینے کے لیے سوکھ جاتی جب چیت کا مہینہ جانے لگتا تو ندی سوکھنا شروع ہوتی اور جب بیساکھ ختم ہونے لگتا تو بالکل سوکھ جاتی، اور پھر اس کی تہہ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر رہ جاتی یا نرم نرم کیچڑ جس میں چلنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریشم کے دبیز غالیچے پر گھوم رہے ہوں۔

چند دنوں میں ہی ندی کا کیچڑ بھی سوکھ جاتا اور اس کے چہرے پر باریک درزوں اور جھریوں کا جال پھیل جاتا کسی محنتی کسان کے چہرے کی طرح اس کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جم جاتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی گرم گداز ریت نے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند نہیں چکھی۔

مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے ندی کو اس طرح سوکھتے ہوئے پایا تھا تو بالکل بے چین اور پریشان ہو گیا تھا، اور اس رات سو بھی نہ سکا تھا۔ اس رات

دادی اماں مجھے بہت دیر تک گود میں لے کر عجیب عجیب کہانیاں سناتی رہیں اور ساری رات دادی اماں کی گود میں لیٹے لیٹے مجھے رویل ندی کی بہت سی پیاری پیاری باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کا ہولے ہولے پتھروں سے ٹھمکتے ہوئے چلنا، اور پتھروں کے درمیان اس کا ذرا تیز ہونا اور کترا کر چلنا، جیسے کبھی کبھی بانو غصے میں گلی کے موڑ پر سے تیزی سے نکل جاتی ہے اور جہاں دو پتھر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہیں وہاں میں اور بانو باجرے کی ڈنڈیوں سے بنی ہوئی پن چکی لٹکا دیتے تھے اور گیلا آٹا پیستے تھے پن چکی ندی کی آہستہ خرامی کے باوجود کیسے کیسے تیز تیز چکی لگا کر گھومتی تھی اور اب یہ ندی سوکھ گئی۔

ان سب باتوں کو یاد کر کے میں نے دادی اماں سے پوچھا

''دادی اماں یہ ہماری ندی کہاں چلی گئی؟''

''زمین کے اندر چھپ گئی''

''کیوں؟''

''سورج سے ڈر کے''

''کیوں؟ یہ سورج سے کیوں ڈرتی ہے؟ سورج تو بہت اچھا ہوتا ہے''

''سورج ایک نہیں ہے بیٹا، دو سورج ہیں ایک تو سردیوں کا سورج ہے، وہ بڑا اچھا اور مہربان ہوتا ہے دوسرا سورج گرمیوں کا ہے یہ بڑا تیز، چمکیلا اور غصے والا ہوتا ہے اور یہ دونوں باری باری ہر سال ہمارے گاؤں میں آتے ہیں جب تک تو سردیوں کا سورج رہتا ہے ہماری ندی اس سے بہت خوش رہتی ہے، لیکن جب گرمیوں کا ظالم سورج آتا ہے تو ہماری ندی کے جسم سے اس کا لباس اتارنا شروع

کرتا ہے ہر روز کپڑے کی ایک تہہ اترتی چلی جاتی ہے اور جب بیساکھ کا آخری دن آتا ہے تو ندی کے جسم پر پانی کی ایک پتلی سی چادرہ جاتی ہے اس رات ہماری ندم شرم کے مارے زمین میں چھپ جاتی ہے اور انتظار کرتی ہے سردیوں کے سورج کا جو اس کے لیے اگلے سال پانی کی نئی پوشاک لائے گا''

میں نے آنکھ جھپکتے ہوئے کہا''سچ مچ گرمیوں کا سورج تو بہت برا ہے''

''لو اب سو جاؤ بیٹا''

مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں نے ایک سوال پوچھا''دادی اماں یہ ہمارے نمک کے پہاڑ کا پانی کیوں کڑوا ہے؟''

ہمارے گاؤں میں بچے پانی کے لیے بہت سوال کرتے ہیں پانی ان کے تخیل کو ہمیشہ اکساتا رہتا ہے دوسرے گاؤں میں، جہاں پانی بہت ہوتا ہے، وہاں کے لڑکے شاید سونے کے جزیرے ڈھونڈتے ہوں گے یا پرستان کا رستہ تلاش کرتے ہوں گے لیکن ہمارے گاؤں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور تلہٹی پر اور پہاڑی پر دور دور تک پانی کو ڈھونڈنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پانی ڈھونڈا تھا اور نمک کے پہاڑ پر پانی کے دو تین نئے چشمے دریافت کیے تھے، مجھے آج تک یاد ہے میں نے کتنے چاؤ اور خوشی سے پانی کا پہلا چشمہ ڈھونڈا تھا، کس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے چٹانوں کے درمیان جھجکتے ہوئے پانی کو اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کا سہارا دے کر باہر بلایا تھا اور جب میں پہلی بار اسے اپنی اوک میں لیا تو پانی میرے ہاتھ میں یوں کانپ رہا تھا جیسے نوگرفتار چڑیا بچے کے ہاتھوں میں کانپتی ہے۔

پھر جب میں اسے اوک میں بھر کر اپنی زبان تک لے گیا، تو مجھے یاد ہے میری کانپتی ہوئی خوشی کیسے تلخ اچھو میں تبدیل ہو گئی تھی پانی نے زبان پر جاتے ہی بچھو کی طرح ڈنک مارا، اور اس کے زہر نے میری روح تک کو کڑوا کر دیا۔ میں نے پانی تھوک دیا اور پھر کسی نئے چشمے کی تلاش میں چل کھڑا ہوا، لیکن نمک کے پہاڑ پر مجھے آج تک میٹھا چشمہ نہ ملا۔ اس لیے جب ندی سوکھنے لگی تو میٹھے چشمے کی یاد نے مجھے بے چین کر دیا اور میں نے دادی اماں سے پوچھا ''دادی اماں یہ نمک کے پہاڑ کا پانی کڑوا کیوں ہے؟''

دادی اماں نے کہا ''یہ تو ایک دوسری کہانی ہے''

''تو سناؤ''

''نہیں اب سو جاؤ''

''نہیں سناؤ، نہیں تو ہم روئیں گے''

''اچھا بابا سناتی ہوں، مگر تم اب چیخو گے نہیں''

''نہیں''

''اور نہ ہی بیچ بیچ میں ٹوکو گے''

''نہیں''

''اچھا تو سنو یہ تم اس طرف نمک کی پہاڑی جو دیکھتے ہو یہ پرانے زمانے میں ایک عورت تھی جو اس پہاڑ کی بیوی ہے، جہاں آج کل میٹھے پانی کے چشمے ہیں''

''پھر؟''

''پھر ایک روز دیووں میں بڑی جنگ چھڑی اور یہ سامنے کا پہاڑ بھی، جو اس

عورت کا خاوند تھا، جنگ میں بھرتی ہو گیا اور بیوی کو یہاں چھوڑ گیا اور اسے کہہ گیا کہ وہ اس کے آنے تک کہیں نہ جائے، نہ کسی سے بات کرے صرف اپنے گھر کا خیال کرے''

''اچھا''

''ہاں پھر کئی سال تک بیوی اپنے دیو خاوند کا انتظار کرتی رہی لیکن اس کا خاوند جنگ سے نہ لوٹا آخر ایک دن اس کے گھر میں ایک سفید دیو آیا اور اس پر عاشق ہو گیا''

''عاشق کسے کہتے ہیں؟''

دادی اماں رک گئیں بولیں ''تو نے پھر ٹوکا''

میں نے دل میں سوچا، دادی اماں اگر خفا ہو گئیں تو باقی کہانی سننے کو نہیں ملے گی، اور کہانی اب دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے چپکے سے سن لینا چاہیے، عاشق کا مطلب بعد میں پوچھ لیں گے اس لیے میں جلدی سے سوچ کر دادی اماں سے کہا ''اچھا اچھا، دادی اماں آگے سناؤ، اب نہیں ٹوکیں گے۔''

دادی اماں بڑی رکھائی سے اس طرح خفا ہو کے بولیں جیسے انہیں کہانی کا آگے آنے والا حصہ پسند نہیں ہے۔

کہنے لگیں ''ہونا کیا تھا، مغربی پہاڑ کی بیوی بے وفا نکلی جب اسے سفید دیو نے جھوٹ موٹ یقین دلا دیا کہ اس کا پہلا خاوند دیووں کی جنگ میں مارا گیا ہے تو اس نے سفید دیو سے شادی کر لی۔''

''دیووں کی جنگ کیوں ہوئی تھی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا

''چل اب آگے نہیں سناؤں گی''

''نہیں دادی اماں، میرے اچھی دادی اماں، اچھا اب، اب بالکل نہیں ٹوکوں گا'' میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا

''پھر؟''

''پھر ایک بہت سالوں کے بعد ایک بوڑھا دیو اس وادی میں آیا، یہ اسی عورت کا پہلا خاوند تھا جب اس نے اپنی بیوی کو سفید دیو کے ساتھ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے کلہاڑا لے کر سفید دیو اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب سے ان دونوں پہاڑوں کو بڑے پیر کی بد دعا ملی ہے اور یہ لوگ سل پتھر ہو گئے ہیں سامنے والے پہاڑ کا پانی اس لیے میٹھا ہے کیونکہ اسے اپنی بیوی سے سچی محبت تھی اس کے مقابل پہاڑ کا پانی کھارا ہے اور اس میں نمک ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور اپنی بے وفائی پر ہر وقت روتی رہتی ہے اور جب اس کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں تو نمک کے ڈلے بن جاتے ہیں، جنہیں ہر روز تمہارا باپ پہاڑ کے اندر جا کے کھود کے نکالتا ہے''

''پھر؟''

''پھر کہانی ختم''

کہانی ختم ہوگئی اور میں بھول گیا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا، مجھے کیا جواب ملا میں کہانی سن لی اطمینان کا سانس لیا اور پلک جھپکتے ہی سو گیا سوتے سوتے میری آنکھوں کے سامنے نمک کی کان کا منظر آیا جہاں میرے ابا کام کرتے تھے، جہاں جوان ہو کر مجھے کام کرنا پڑا اور جہاں پہلی بار میں اپنی اماں کے ساتھ اپنے ابا کا

کھانا لے کے گیا تھا۔ اُفوہ! کتنی بڑی کان تھی وہ چاروں طرف نمک کے پہاڑ، نمک کے ستون، نمک کے آئینے، نمک کی دیواروں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ نمک کی بڑی جھیل تھی جس کے چاروں طرف نیلگوں دیواریں تھیں اور چھت بھی نمک کی تھی جس سے قطرہ قطرہ کر کے نمک کا پانی رستا تھا اور نیچے گر کر جھیل بن گیا تھا اور یکا یک مجھے خیال آیا یہ اس عورت کے آنسو ہیں جو بڑے پیر کی بد دعا سے نمک کا پہاڑ بن چکی ہے۔

میرے ابا اس جھیل کو دیکھ کر بولے ''یہاں اس قدر پانی ہے پھر بھی پانی کہیں نہیں ملتا۔ دن بھر نمک کی کان میں کام کرتے کرتے سارے جسم پر نمک کی پتلی سی جھلی چڑھ جاتی ہے جو کھر چو تو نمک چورا چورا ہو کر گرنے لگتا ہے۔ اس وقت کس قدر وحشت ہوتی ہے جی چاہتا ہے کہیں میٹھے پانی کی جھیل ہو اور آدمی اس میں غوطے لگاتا رہے۔''

پانی! پانی!

پانی سارے گاؤں میں کہیں نہیں تھا۔ پانی نمک کے پہاڑ پر بھی نہیں تھا پانی تھا تو سامنے پہاڑ پر جس کی محبت نے بے وفائی نہیں کی تھی، یا پانی پھر رویل ندی میں تھا لیکن یہ ندی بھی چھ مہینے غائب رہتی تھی اور پھر آخر ایک دن یہ بالکل ہی غائب ہو گئی اور آج تک اس کی تہہ کے نیلے پتھر اور سوکھی ریت اور اس کے کنارے کنارے چلنے والی عورتوں کے نا امید قدم اس کی راہ تکتے ہیں۔ لیکن یہ میرے بچپن کی کہانی نہیں ہے، یہ میرے لڑکپن کی کہانی ہے جب ہمارے گاؤں سے بہت دور ان پہاڑی سلسلوں کے دوسری طرف سینکڑوں میل لمبی جاگیر کے مالک

راجا اکبر علی خان نے ہمارید یہات والوں کی مرضی کے خلاف رویل ندی کا بہاؤ موڑ کر اپنی جاگیر کی طرف کرلیا اور ہماری تلہٹی کو اور اس آس پاس کے بہت سے علاقے کو سوکھا، بنجر اور ویران کر دیا۔ اس وقت اس ندی کے کنارے کا ہمارا گاؤں اور اس وادی کے اور دوسرے بتہ سے گاؤں یوں پریشان ہو گئے، جیسے بہت سے بچے یکا یک اپنی ماں کے مر جانے پر یتیم ہو جاتے ہیں اس طرح ہمارے لیے رویل ندی مر گئی اور اس کا پانی بھی مر گیا اور ہمارے لیے ایک تلخ یاد چھوڑ گیا۔

مجھے یاد ہے اس وقت گاؤں والوں نے دوسرے گاؤں والوں سے مل کر سرکار کو ایک عرضی دی تھی، راجا اکبر علی خان کے ظلم کے خلاف اور سرکار سے اپنی کھوئی ہوئی ندی مانگی تھی کیونکہ ندی تو گھر کی عورت کی طرح ہے وہ گھر میں پانی دیتی ہے، کھیتوں میں کام کرتی ہے، ہمارے کپڑے دھوتی ہے جسم کو صاف رکھتی ہے ندی کے گیت اس کے بچے ہیں جنہیں وہ لوری دیتے ہوئے تھپکتے ہوئے مغرب کے جھولے کی طرف لے جاتی ہے، پانی کے بغیر ہمارا گاؤں بالکل ایسا تھا جیسے گھر عورت کے بغیر، گاؤں والوں کو بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ان کے گھر سے ان کی لڑکی اغوا کر لی ہو۔ وہی غم، وہی غصہ تھا، وہی تیور تھے، وہی مرنے مارنے کے انداز تھے۔

لیکن راجا اکبر علی خان چکوال کے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا حکومت کے افسروں کے ساتھ اس کا گہرا رسوخ تھا، نمک کی کان کا ٹھیکا بھی اس کے پاس تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں والوں کو ان کی ندی واپس نہ ملی، الٹا ہمارے بہت سے

گاؤں والے، جونمک کی کان میں کام کرتے تھے، باہر نکال دیئے گئے، ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گاؤں کے اغوا شدہ پانی کو واپس لانے کی جرأت کی تھی۔ مجھے یاد ہے اس روز ابا کانپتے کانپتے گھر میں آئے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہتے ''توبہ توبہ! کیسی غلطی ہوئی، وہ تو اللہ کا کرم تھا میں بچ گیا ورنہ راجا صاحب مجھے بھی نکال دیتے میں تو اب کبھی راجا صاحب کے خلاف عرضی نہ دوں، چاہے وہ پانی تو کیا میری لڑکی ہی کیوں نہ اغوا کر کے لے جائیں توبہ توبہ!''

اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے گاؤں میں پانی کی عزت لڑکی کی طرح بیش قیمت ہے۔ پانی، جو زندگی دیتا ہے، پانی، جو رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے پانی، جو منہ دھونے کو نہیں ملتا، پانی، جس کے نہ ہونے سے ہمارے کپڑے بھورے اور میلے رہتے ہیں، سر میں جوئیں، جسم پر پسینے کی دھاریاں اور روح پر نمک جما رہتا ہے یہ پانی تو سونے سے زیادہ قیمتی ہے اور لڑکی سے زیادہ حسین، اس کی قدر و قیمت ہمارے گاؤں والوں سے پوچھیے جن کی زندگی پانی کے لیے لڑتے جھگڑتے گزرتی ہے۔ ایک دفعہ سامنے کے پہاڑ کے میٹھے چشمے سے پانی لانے کے لیے سرور خان کی بیوی سیداں اور ایوب خان کی بیوی عائشاں دونوں آپس میں لڑ پڑی تھیں۔ حالانکہ دونوں اتنی گہری سہیلیاں تھیں کہ ہر وقت اکٹھی رہتیں۔ گھر بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے چشمے پر بھی پانی اکٹھے لینے جاتی تھیں پہلے ایک پھر دوسری پانی بھرتی باری باری وہ دونوں ایک دوسرے کا گھڑا اٹھا کر سر پر رکھتیں اور پھر باتیں کرتی ہوئی واپس چل پڑتیں۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا، آج نہ جانے دونوں کو کیا

جلدی تھی ایک کہتی تھی پہلے پانی میں بھروں گی، دوسری کہنے لگی،نہیں میں بھروں گی۔ شاید انہیں غصہ ایک دوسرے کے خلاف نہیں تھا۔ شاید غصہ انہیں اس لیے تھا کہ یہاں میٹھے پانی کا ایک ہی چشمہ تھا جہاں ندی کے سوکھ جانے کے بعد دور دور سے لوگ پانی لینے کے لیے آتے تھے، منہ اندھیرے ہی عورتیں گھڑا لے کے چل پڑتیں۔ جب یہاں پہنچتیں تو یا تو ایک لمبی لائن پہلے سے موجود ہوتی یا چشمے کے منہ سے ایک ایسی پتلی سی دھار کو نکلتے دیکھتیں جو آدھے گھنٹے میں مشکل سے ایک گھڑا بھرتی تھی اور تین کوس کا آنا جانا قیامت سے کم نہ تھا۔۔۔۔۔۔لڑائی کی وجہ کچھ بھی ہو اصل لڑائی پانی کی تھی۔ دونوں عورتوں نے دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے کے چہرے نوچ لیے، گھڑے توڑ دیئے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور پھر روتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو گئیں۔ تب سیداں نے سرور خان کو بھڑکایا اور عائشاں نے ایوب خان کو دونوں خاوند غصے سے بے تاب ہو کے کلہاڑیاں لے کے باہر نکل پڑے اور بیشتر اس کے کہ لوگ آ کے بیچ بچاؤ کریں دونوں نے کلہاڑیوں سے ایک دوسرے کو ختم کر دیا شام ہوتے ہوتے دونوں ہمساؤں کا جنازہ نکل گیا ہمارے گاؤں کے قبرستان کی بہت سی قبریں پانی نے بنائی ہیں۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں جب یہ قتل ہوئے اس وقت سامنے کے پہاڑ پر ہی ایک میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ لیکن بعد میں جب میں اور بڑا ہوا تو یہاں ایک اور چشمہ بھی نکل آیا۔ اس نئے چشمے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہمارے پوٹھوہار میں سخت کال پڑا ہوا تھا اور گرمی کی وجہ سے علاقے کے سارے ندی نالے اور کنوئیں سوکھ گئے تھے صرف کہیں کہیں ان چشموں میں پانی رہ

گیا تھا جو پہاڑوں کی کھوؤں میں تھے جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہ تھا۔ ان دنوں ہمارے گھروں میں عورتیں رات کے دو بجے ہی اٹھ کر چل دیتیں اور چشمے کے نیچے ہمیشہ گھڑوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دیتی۔ ایک لمبی پیاسی خالی گھڑوں کی قطار، جس میں سے پیاس سے بلکتے ہوئے بچوں کی صدا آتی تھی۔

اس زمانے میں بڑے بڑے لوگ نیکی اور خدائی سے منحرف ہو گئے اور اب لوگوں میں سب سے برا کام ذیلدار ملک خان نے کیا اس نے تھانیدار فضل علی سے مل کر اس چشمے پر پولیس کا پہرہ لگا دیا اور پھر تحصیلدار غلام نبی سے مل کر چشمے کے اردگرد کی ساری زمین خرید کر راتوں رات اس پر ایک چاردیواری باندھ دی اور چاردیواری کے باہر تالا لگا دیا اب چشمے سے کوئی آدمی بلا اجازت پانی نہ لے سکتا تھا کیونکہ اب یہ چشمہ ذیلدار کی ملکیت تھا اور ذیلدار نے چشمے سے پانی لے جانے والے گھڑوں پر اپنا ٹیکس رکھ دیا۔ ایک گھڑے پر ایک آنہ، دو گھڑوں پر دو آنے۔

تب سارے گاؤں میں اس ظلم کے خلاف شور مچ گیا۔ لیکن پولیس اور سرکار ذیلدار ملک خان کی حمایت میں تھی، قانون بھی اس کی طرف تھا اور جدھر قانون تھا پانی بھی ادھر تھا۔ اس لیے گاؤں کے سارے جوان اور بڈھے اور بچے جمع ہو کے میرے ابا کے پاس آئے اور بولے ''چچا خدا بخش اب تم ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوا سکتے ہو۔۔۔۔''

''وہ کیسے؟'' میرے ابا نے حیران ہو کے پوچھا

سفید ریش بڈھے حاکم خان نے کہا ''یاد ہے یہ میٹھے پانی کا چشمہ جو اب ذیلدار ملک خان کا ہو گیا، یہ چشمہ بھی تم نے دریافت کیا تھا۔ کیا تم دوسرا چشمہ نہیں

ڈھونڈ سکتے؟ آخر اس پہاڑ کے اندر، اس کے سینے میں اور بھی تو کہیں میٹھا پانی ہو گیا۔ جو انسان کو آب حیات بخش سکتا ہے خدا بخش تم ہم سے قابل ہو اپنی عقل دوڑاؤ ہم تمہارے ساتھ مارنے مرنے کو تیار ہیں ہمارے گاؤں میں پانی نہیں ہے اوراب پانی چاہیے"

میرا ابا چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسی وقت اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا سارا گاؤں اس کے ساتھ تھا۔ پہاڑ پر چڑھائی تھی اور تلاش پانی کی تھی فرہاد کی کوہ کنی سے پانی کی تلاش مشکل ہے یہ بات مجھے اس روز معلوم ہوئی کیونکہ پانی سامنے نہیں ہوتا وہ تو ایک چھلاوے کی طرح پہاڑ کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا ہے۔ پانی خانہ بدوش ہے آج یہاں، کل وہاں پانی ایک پردیسی ہے جس کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں پانی کا وجود اس نازک خوشبو کی طرح ہے جو تیز دھوپ میں اڑ جاتی ہے وہ کبھی کسی ایک کا ہو کے نہیں رہتا، کبھی ایک ٹھکانے پر نہیں ملتا کسی ایک چشمے میں نہیں رہتا وہ ہمیشہ یہاں سے وہاں، ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک **ملک** سے دوسرے **ملک** میں گھومتا ہے۔ پاسپورٹ کے بغیر ایسے ہرجائی کی تلاش کے لیے ایک تیشہ نہیں ایک ایسا آئینہ چاہیے جس کے سامنے پہاڑ کا دل اس طرح ہو جیسے ایک کھلی کتاب آخر میرے گاؤں والوں نے کچھ سمجھ کر میرے باپ کو اس کام کے لیے چنا تھا۔

اس روز ہم دن بھر اس بلند و بالا پہاڑ کی خاک چھانتے رہے ہم نے کہاں کہاں اس پانی کو تلاش نہیں کیا! بیریوں کی گھنی جھاڑیوں میں، چٹانوں کی گہری درزوں میں، سیاہ ڈراؤنی کھوؤں میں، جنگلی جانوروں کے بھٹ میں پانی تلاش

میں ہم نے سارے پرانے چشمے کھود ڈالے لیکن ان کا کھودنا ایسا ہی تھا جیسے آدمی زندگی کی تلاش میں قبریں کھود ڈالے۔ پانی کہیں نہیں ملا ایک چور کی طرح اس نے جگہ جگہ اپنے جھوٹے سراغ چھوڑے لیکن آخر کو وہ ہمیشہ ہمیں جل دے کر کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ جانے قطرے کے کس کونے کے اندر کس مقام پر وہ کس گہرے غار میں بیٹھا ہوا اپنے چاہنے والوں پر ہنس رہا تھا۔

لیکن گاؤں والوں نے آس نہیں چھوڑی۔ وہ سارا دن میرے ابا کے پیچھے پیچھے پانی کی کھوج کرتے رہے۔ آخر شام ہونے کو آئی تو میرے ابا نے پسینہ پونچھ کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ادھر نظر دوڑائی جدھر سورج غروب ہو رہا تھا۔ یکا یک انہیں غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چٹانوں کی ایک گہری درز میں فرن کا سبزہ نظر آیا اور کہتے ہیں جہاں فرن کا سبزہ ہوتا ہے وہاں پانی ضرور ہوتا ہے۔ فرن پانی کا جھنڈا ہے اور پانی ایک گھومنے والی قوم ہے پانی جہاں جاتا ہے اپنا جھنڈا ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک چیخ مار کر میرے ابا اس طرف لپکے جہاں فرن کا سبزہ اگا ہوا تھا۔ گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے جلدی جلدی میں میرے ابا نے اپنے ناخنوں ہی سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا زمین، جو اوپر سے سخت تھی، نرم ہوتی گئی، گیلی ہوتی گئی۔ آخر میں زور سے پانی کی ایک دھار اوپر آئی اور سینکڑوں سوکھے ہوئے گلوں سے مسرت کی آواز نکلی

''پانی! پانی!''

ابا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اوک میں پانی بھرا ساری نگاہیں ابا کے

چہرے پر تھیں، سینکڑوں دل دھڑک رہے تھے یا اللہ پانی میٹھا ہو، یا اللہ پانی میٹھا ہو

ابا نے پانی چکھا ''پانی میٹھا ہے'' ابا نے خوشی سے کہا

گاؤں والے زور سے چلائے ''پانی میٹھا ہے!''

ساری وادی میں آوازیں گونج اٹھیں ''پانی میٹھا ہے، پانی مل گیا، پانی میٹھا ہے!''

ساری وادی میں ڈھول بجنے لگے عورتیں گانے لگیں، جوان ناچنے لگے بچے شور مچانے لگے گاؤں والوں نے جلدی سے چشمے کو کھود کر اپنے گھیرے میں لے لیا اب چشمہ ان کے بیچ میں تھا اور وہ اس کے چاروں طرف تھے اور وہ اسے مڑ مڑ کر اس طرح محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی اس رات کوئی آدمی گاؤں میں واپس نہیں گیا۔ اس رات سارے گاؤں نے چشمے کے کنارے جشن منایا۔ اس رات تاروں کی گود میں بھومی بیریوں کے سائے میں ماؤں نے چولہے سلگائے، بچوں کو تھپک تھپک کر سلایا۔ اس رات کنواریوں نے لہک لہک کر گیت گائے۔ ایسے گیت گائے، ایسے گیت جو پانی کی طرح نرمل اور سندر تھے، جن میں جنگلی جھرنوں کا سا حسن اور آبشاروں کی سی روانی تھی۔ اس رات ساری عورتیں حسین تھیں اور ساری زمین زرخیز تھی اور ساری جڑیں ہری تھیں اور سارے بیج تخلیق سے بے قرار ہو کر پھوٹ رہے تھے۔

ایسی رات ہمارے گاؤں میں کب آئی تھی! جب ابا خدا بخش نے پانی ڈھونڈ

نکالا تھا پانی جو انسان کے ہاتھوں کی محنت تھا اس کے دل کی محبت تھا۔ آج پانی ہمارے ہاں اس طرح آیا تھا جیسے بارات ڈولی لے کے آتی ہے وہ نیا چشمہ ہمارے درمیان آج اس طرح ہولے ہولے شرمیلے انداز میں چل رہا تھا جیسے نئی دلہن جھجک جھجک اجنبی آنگن میں پاؤں رکھتی ہے اس رات میرے ایک ہاتھ میں پانی تھا، دوسرے ہاتھ میں بانو کا ہاتھ تھا اور آسمان پر ستارے تھے۔

اس نئے چشمے کے ساتھ میری جوانی کی بہترین یادیں وابستہ ہیں اس چشمے کے کنارے بانو سے محبت کی بانو جس کا حسن پانی کی طرح نایاب تھا، جسے دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ جانے اس زمین کی گود میں کتنے میٹھے چشمے نہاں ہیں، کتنی حسین یادیں منجمد ہیں، موسم گرما کے کتنے چمکتے ہوئے پھول، خزاؤں کے سنہری پتے، زمستان کی پاکیزہ برف بانو کی محبت بھی کتنی خاموش اور چپ چاپ تھی، زمین کے نیچے بہنے والے پانی کی طرح وہ رات کے اندھیرے میں یا فجر سے بہت پہلے اس چشمے کے کنارے آتی تھی، جب یہاں اور کوئی اور نہ ہوتا میرے سوا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تبسم کی ضیا پھیل جاتی، جیسے اندھیرے میں سحر کا اجالا پھیلتا ہے وہ گھڑے و چشمے کی دھار کے نیچے رکھ دیتی۔ پانی گھڑے سے باتیں کرنے لگتا اور میں بانو سے دھیرے دھیرے باتیں کرتے کرتے گھڑا ابھر جاتا اور ہمارے دل خوشی سے معمور ہو جاتے اور ہمارے جانے بغیر کہیں دور سے صبح یوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آتی جیسے باد نسیم سنگترے کے پھولوں کی سی انگلیاں لیے سوئے ہوئے چہروں پر سے گزر جاتی ہے اور ہم چونک کر اٹھ کھڑے ہوتے اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ پھر میں اس کا گھڑا اٹھا کر اس کے سر کے اوپر

رکھی ہوئی سرخ پٹی پر رکھتا اور وہ مسکرا کر، پلٹ کر اور گھوم کر ڈھلوان پر سے گزر جاتی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت بھی دیکھتا رہتا جب دوسری عورتیں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتیں اور مجھے وہ دن یاد آتا جب میں نے دادی اماں سے پوچھا تھا ''دادی اماں عاشق کسے کہتے ہیں؟''

اور پھر اس چشمے کے کنارے مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں کان میں کام کرتا تھا اور دن بھر تھک کے گھر لوٹتا تھا اور اس تھکن سے چور ہو کر سو جاتا تھا صبح ہی آنکھ کھلتی تھی کئی دنوں سے میں بانو سے چشمے پر ملنے نہ گیا تھا مگر کوئی بے قراری نہ تھی وہ ساتھ کے گھر میں تو رہتی تھی انہی دنوں میں اس کے چچا کا لڑکا غضنفر بھی آیا اور چلا بھی گیا لیکن مجھے اس سے ملنے کی بھی فرصت نہ ملی کیونکہ کان میں نیا نیا ملازم ہوا تھا، کام سیکھنے کا بہت شوق تھا اور یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ نمک کی کان میں جا کے ہر شخص نمک کا ہو جاتا ہے

ایک رات بانو نے مجھے کہا کہ میں رات کے دو بجے چشمے پر اس سے ملوں میں نے کہا ''میں بہت تھکا ہوا ہوں'' وہ بولی ''نہیں ضروری کام ہے، آنا ہوگا'' چنانچہ میں گیا۔

دو بجے کے قریب آدھی رات میں چشمے پر کوئی نہیں تھا، ہم دونوں کے سوا میں نے اس سے پوچھا ''کیا بات ہے؟''

وہ دیر تک چپ رہی پھر میں نے پوچھا ''بھئی بتاؤ، آخر کیا بات ہے؟''

وہ بولی ''میں گاؤں چھوڑ کر جا رہی ہوں''

میرا دل دھک سے رہ گیا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چشمہ چلتا چلتا رک گیا

میرے گلے سے آواز نکلی ''کیوں؟'' ''میری شادی طے ہوگئی ہے''

''کس سے؟''

''چاچا کے لڑکے کے ساتھ، جو لام سے ہو کے یہاں آیا تھا۔ وہ چکوال میں ہے، صوبیدار ہے۔''

''اور تم جا رہی ہو!'' میں نے تلخی سے پوچھا

''ہاں''

وہ چپ ہوگئی، میں بھی چپ ہو گیا سوچ رہا تھا اسے ابھی جان سے مار دوں یا شادی کی رات قتل کروں تھوڑی دیر رک کے بانو پھر بولی ''سنا ہے چکوال میں پانی بہت ہوتا ہے سنا ہے وہاں بڑے بڑے نل ہوتے ہیں جن سے جب چاہو ٹوٹی گھما کر پانی نکال لو۔''

اس کی آواز خوشی کے مارے کانپ رہی تھی وہ شاید اور بھی کچھ کہتی لیکن شاید میری آزردگی کا خیال کر کے چپ ہوگئی

میں نے اس کے بالکل قریب آ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں میں میری محبت سے انکار نہیں تھا بلکہ پانی کا اقرار تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے شانے چھوڑ دیئے اور الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ محبت کی سچائی، خلوص اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا پانی بھی مانگتی ہے۔ بانو کی جھکی ہوئی نگاہوں میں اک ایسی جانگسل شکایت کا گریز تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ جانتے ہو ہمارے گاؤں میں کہیں پانی ملتا یہاں میں دو دو مہینے نہا

نہیں سکتی۔ مجھے اپنے آپ سے، اپنے جسم سے نفرت سی ہوگئی ہے۔

بانو چپ چاپ زمین پر چشمے کے کنارے بیٹھ گئی میں اس تاریکی میں بھی اس کی آنکھوں کے اندر اس محبت کے خواب دیکھ سکتا تھا جو گندے بدبودار جسموں، پسوؤں، جوؤں اور کھٹملوں کی ماری غلیظ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی محبت نہ تھی، اس محبت سے نہائے ہوئے جسموں، دھلے ہوئے کپڑوں اور نئے لباس کی مہک آتی تھی۔

میں بالکل مجبور اور بے بس ہوکر ایک طرف بیٹھ گیا

رات کے دو بجے بانو اور میں دونوں چپ چاپ

کبھی ایسا سناٹا جیسے ساری دنیا خالی ہے، کبھی ایسی خاموشی جیسے سارے آنسو سو گئے ہیں۔

چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی بانو آہستہ آہستہ گھڑے میں پانی بھرتی رہی۔ آہستہ آہستہ پانی گھڑے میں گرتا ہوا بانو سے باتیں کرتا رہا، اس سے کچھ کہتا رہا، مجھ سے کچھ کہتا رہا۔ پانی کی باتیں انسان کی بہترین باتیں ہیں

بانو چلی گئی

جب بانو چلی گئی تو میرے ذہن میں بچپن کی وہ کہانی آئی جب محبت روئی تھی اور آنسو نمک کے ڈلے بن گئے تھے۔ اس وقت میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا، لیکن میرے دل کے اندر نمک کے کتنے ڈلے اکٹھے ہو گئے تھے! میرے دل کے اندر نمک کی ایک پوری کان موجود تھی۔ نمک کی دیواریں، ستون، غار اور کھارے پانی کی ایک پوری جھیل میرے دل و دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی

جھلی چڑھ گئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر میں اپنے جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنسو ڈھلک کر بہہ نکلیں گے اس لیے میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور جب وہ میری طرف دیکھ کر ڈھلوان پر مڑ گئی اس وقت بھی میں چپ چاپ بیٹھا رہا کیوں کہ میرے پاس پانی نہیں تھا اور بانو پانی کے پاس جا رہی تھی۔

جس رات بانو کا بیاہ غضنفر سے ہوا اس رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا میں نے دیکھا کہ ہماری کھوئی ہوئی ندی ہمیں واپس مل گئی ہے اور نمک کے پہاڑ پر میٹھے پانی کے چشمے ابل رہے ہیں اور ہمارے گاؤں کے مرکز میں ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے یہ درخت سارے کا سارا پانی کا ہے۔ اس کی جڑیں، شاخیں، پھل، پھول، پتیاں سب پانی کی ہیں اور اس درخت کی شاخوں سے، پتوں سے پانی بہہ رہا ہے اور یہ پانی ہمارے گاؤں کی بنجر زمین کو سیراب کر رہا ہے۔

اور میں نے دیکھا کہ کسان ہل جوت رہے ہیں، عورتیں کپڑے دھو رہی ہیں، کان کن نہا رہے ہیں اور بچے پھولوں کے ہار لیے پانی کے درخت کے گرد ناچ رہے ہیں اور بانو صاف ستھرے کپڑے پہنے میرے کندھے سے لگی مجھ سے کہہ رہی ہے۔

''اب ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت اگ آیا ہے اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

یہ بڑا عجیب خواب تھا لیکن میں نے جب ابا کو سنایا تو مارے ڈر کے کانپنے لگے، بولے ''تم نے یہ خواب میرے سوا کسی دوسرے کو تو نہیں سنایا؟''

میں نے کہا ''نہیں ابا، مگر آپ ڈر کیوں گئے ہیں؟ یہ تو ایک خواب ہے''

وہ بولے ''ارے خواب تو ہے، مگر یہ ایک سرخ خواب ہے''

میں نے ہنس کر کہا ''نہیں ابا، جو درخت میں نے خواب میں دیکھا وہ سرخ نہیں تھا۔ اس کا رنگ تو بالکل ایسا تھا جیسے پانی کا ہوتا ہے وہ پانی کا درخت تھا اس کا تنا، شاخیں، پتے، سب پانی کے تھے۔ ہاں اس درخت میں پھلوں کی جگہ کٹ گلاس کی چمکتی ہوئی صراحیاں لٹکی تھیں اور ان میں پانی بچوں کی ہنسی کی طرح چمکتا تھا اور فواروں کی طرح اونچا جا کے گرتا تھا۔''

وہ بولے ''کچھ بھی ہو یہ بڑا خطرناک سپنا ہے اگر پولیس نے کہیں سن لیا یا تم نے کسی سے اس کا ذکر کر دیا تو وہ تمہیں اس طرح پکڑ کر لے جائیں گے جس طرح وہ ان مزدوروں کو پکڑ کر لے گئے تھے جنہوں نے ہمارے گاؤں کی ندی کو واپس لانا چاہا تھا اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرو اسے بھول جاؤ جیسے تم نے یہ خواب کبھی نہ دیکھا تھا کیونکہ اس خواب کا چرچا کرنے سے کچھ نہ ہو گا۔ سوکھی ندی ہمیشہ سوکھی رہے گی اور پیاسے سدا پیاسے رہیں گے''

مجھے اپنے ابا کے لہجے کی حرت نا کی آج تک یاد ہے، مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شروع شروع میں اس کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔ لیکن جب چند دن گزر گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے کان کے چند مزدور ساتھیوں سے اپنے خواب کا ذکر کیا تو وہ میرا خواب سن کر ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے تو انہوں نے کہا ''بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے یہ خواب تو بہت اچھا ہے اور یہاں کان میں ہر ایک دیکھ چکا ہے''

''کیا سچ کہتے ہو! وہی پانی کا درخت؟''

’’ہاں، ہاں وہی پانی کا درخت گاؤں میں، ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کا سرچشمہ ہر نمک کی کان میں!‘‘

’’گھبراؤ نہیں، ایک دن یہ خواب ضرور پورا ہوگا‘‘

پہلے مجھے ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرتے کرتے اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا ایک دن ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت ضرور اگے گا اور جو جام خالی ہیں وہ بھر جائیں گے اور جو کپڑے میلے ہیں وہ دھل جائیں گے اور جو دل ترسے ہوئے ہیں وہ کھل جائیں گے اور ساری زمینیں اور ساری محبتیں اور سارے ویرانے اور سارے صحرا شاداب ہو جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

پرانا قرضہ

آج سے دوسو سال پہلے انگریزی فوجوں نے امریکہ کی آزادی کی لڑائی کے دنوں میں فلے ڈیلفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو نقصان پہنچایا تھا۔

اس سلسلے میں کچھ مہینے ہوئے اسی گرجا گھر کے پادری جوزف کوسی نے انگلینڈ سے ہرجانے کی رقم طلب کرلی۔

دوسو سال بعد! انگلینڈ کے چانسلر آف ایکس چیکر نے اس گرجے کے پادری کو ایک بہت اچھا خط لکھا اور ہرجانے کے طور پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ اور ایک پنس کی رقم ادا کی۔

یہ خط تمام دنیا کے اخباروں میں چھپ چکا ہے اور دنیا کے چاروں کونوں میں انگریزوں کی سچائی اور فیصلے کی دھوم مچ گئی ہے۔

لوگ کہتے ہیں دنیا میں جب کہ بھائی بھائی کا قرضہ ادا نہیں کرتا

آج بھی ایسی قوم ہے جو اپنا قرضہ پائی پائی کرکے چکا دیتی ہے اور وہ ہے انگریز قوم

دوسو سال پرانا قرضہ چکا کر انگریزی چانسلر نے انگریزی شرافت کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ہندوستان میں انگیزی چانسلر آف ایکس چیکر کے خط کا بہت اثر ہوا ہے اور سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہوا ہے

جب میں نے اخباروں میں یہ خط پڑھا تو میں انگریزی حکومت کی انسانی

محبت اور شریف عادات کا قائل ہو گیا

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں دو گھنٹے تک روتا رہا

پھر میں آنسو پونچھ کر اپنی گندی کھولی سے باہر نکلا اور اخبار سے یہ خبر کاٹ کر کچھ لوگوں سے ملنے چلا گیا۔

ان ملاقاتوں کا نتیجہ اب تک یہ نکلا ہے کہ صرف ہمارے ملک ہندوستان سے سنیکڑوں لوگوں نے انگریزی وزیر کو مبارک باد کے خط لکھے ہیں

یہ خط دنیا کے کسی اخبار میں نہیں چھپے ہیں۔

یہ خط پہلی بار آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جگہ کی کمی کی وجہ سے سارے خط تو نہیں چھاپے جا سکتے نمونہ کے طور پر صرف کچھ خط پیش کرتا ہوں

پہلا خط

پانڈے شبھ وجن شرما کی طرف سے، چانسلر آف ایکس چیکر کے نام!

جے رام کی!

آج سے دو سو سال پہلے انگریزوں نے فلے ڈیلفیا کے ایک گرجا گھر کی عمارت کو نقصان پہنچایا تھا، اس کے لیے آپ نے چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کا ہرجانہ ادا کر کے جو قدم اٹھایا ہے اس کے لیے میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اسی طرح انگریزی فوجوں نے لڑائی لڑتے ہوئے میرے دو مندروں کو نقصان پہنچایا تھا۔

انگریزی فوجوں کی گولہ باری سے ہمارا ایک مندر تو بالکل ٹوٹ گیا تھا، اور دوسرے کی چاردیوای گر گئی تھی

اس زمانے کے تحصیلدار نے نقصان کا اندازہ دو لاکھ روپے لگایا تھا مہربانی کر کے یہ رقم جلد از جلد بھیجنے کی تکلف کیجیے

نقصان کا تخمینہ تحصیلدار بنارس کے تحریری ثبوت کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

دوسرا خط

مولانا صلاح الدین کی طرف سے لارڈ بشپ آف کینٹربیری کے نام

السلام علیکم!

آپ کو معلوم ہوگا کہ شری رنگ پٹم کے مقام پر ٹیپو سلطان کے خلاف لڑتے ہوئے انگریزی فوجوں نے تین مسجدوں کو شہید کر دیا تھا۔

علاوہ جانی اور روحانی نقصان کے صرف مالی نقصان کا اندازہ دس لاکھ روپے کا ہے جو انگریزی تاریخ نگاروں کے تاریخی ریکارڈ سے ثابت کیا جا سکتا ہے جس کی ایک نقل خط کے ساتھ نتھی کر رہا ہوں

مجھے پورا بھروسا ہے کہ فلے ڈیلفیا کے گرجا گھر کی مثال کو سامنے رکھ کر ہمیں بھی دس لاکھ کا ہرجانہ ضرور ادا کر دیا جائے گا

مسجد اور گرجا گھر دونوں خدا کے گھر ہوتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں

لہذا اگر جا گھر کے ہر جانے کو نظر میں رکھتے ہوئے اس خاکسار کو مسجد کا ہرجانہ دلوایا جائے۔

یہ بات میرے لیے اور حامیان اسلام کے بصد تشکر و امتنان کا باعث ہو گی

مخلص

الحاج مولانا صلاح الدین چشتی

امام مسجد ہشری رنگ پٹم

تیسرا خط

ماسٹا تارا سنگھ کی طرف سے، لارڈ ہوم کے نام

ست سری اکال!

آپ جانتے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ شہر پنجاب کے داروں پر انگریزوں نے فوجی دباؤ ڈال کر ان سے کوہ نور ہیرا چھین لیا تھا۔

اس دھاندلی کے خلاف اس وقت بھی آواز اٹھائی گئی تھی اور انگریزی حکومت کے دور میں بھی ہندوستانیوں کی طرف سے بار بار احتجاج کیا گیا تھا۔

اب جب کہ انگریزی حکومت پرانے قرضے چکا رہی ہے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوہ نور ہمیں واپس دیا جائے

جوہریوں کے اندازے کے حساب سے کوہ نور کی قیمت آٹھ کروڑ روپے معلوم ہوتی ہے ہم کو کوہ نور فوراً مل جانا چاہیے۔

چوتھا خط

بیگم رفعت محل آف لکھنو کی طرف سے انگریزی چانسلر کے نام

آداب عرض!

بیگمات اودھ کے قصہ سے تو آپ واقف ہوں گے

جب کمپنی بہادر کو اپنی فوجوں کو تنخواہ بانٹنے کے سلسلے میں روپیہ کی سخت ضرورت پڑی تو اس وقت کے جناب لاٹ صاحب بہادر وارن ہیسٹنگز مرحوم نے (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) بیگمات اودھ کا سارا خزانہ ضبط کر لیا تھا جو پچھتر کروڑ روپے کی مالیت کا تھا۔

ازراہ کرم وہ رقم جلد ارسال فرمایئے

ان دنوں لکھنو میں سیلاب بھی آ رہا ہے

اس لیے بندی کو اگر رقم جلد وصول پائے گی تو آپ کی جان و مال کو دعا دے گی

امید ہے کہ آپ اس ذرا سی رقم کے لیے مجھے یاددہانی کا موقع نہ دیں گے

پانچواں خط

میئر آف کلکتہ کی جانب سے میئر آف لندن کے نام

یہ میں کیا سنتا ہوں؟

انگریزی چانسلر نے آج سے دو سو سال پہلے کے ایک امریکی گرجا گھر کا جنگلا ٹوٹ جانے پر چھ پونڈ آٹھ شلنگ ایک پنس کی بہت بڑی رقم ادا کی ہے

کیا رقم ادا کرتے وقت وہ بلیک ہول آف کلکتہ کا واقعہ بھول گئے
جو لارڈ کلائیو کی بد معاشی اور بری عادت کی وجہ سے ہوئی تھی
اور جس میں درجنوں بنگالیوں کی جانیں چلی گئی تھیں
یقیناً ایک انسان کی زندگی گرجا گھر کی دیوار سے زیادہ قیمتی ہے
مہربانی کر کے ان جانوں کا ہرجانہ ان کے وارثوں کو ادا کر کے بنگالی قوم کو شکریہ کا موقع دیجئے۔
مرنے والوں کے وارثوں کی تعداد آج دو لاکھ سے اوپر ہے
ہر آدمی کو ایک سو روپیہ ادا کرنے پر یہ ہرجانہ دو کروڑ پچاس لاکھ اٹھتر ہزار نو سو سات روپے سات آنے تین نئے پیسے ہو گا
اگر آپ نے یہ روپیہ ادا نہ کیا تو ہم آپ کو چھ پونڈ آٹھ شلنگ اور ایک پونڈ والے چیک کو محض ایک سنٹ سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

چھٹا خط

ہندوستان کے وزیر اعظم کی طرف سے انگریزی وزیر اعظم کے نام
یوایکسی لینسی!
یہ کہنا مشکل ہے کہ برطانوی چانسلر نے دو سو برس پہلے کے گرجا گھر کے نقصان کا ہرجانہ ادا کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے یا غلط
میں مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن اس قصہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک

ہرجانہ ادا کیا جاسکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں کیا جاسکتا

مگراس بات کا بھی آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا

کیونکہ دنیا بہت پیچیدہ ہے اور اس میں اتنی طاقتیں اتنے رجحانات اتنے جذبات کام کرتے ہیں کہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہے بہرحال اس دنیا میں زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ ملانی ہی پڑتی ہے چاہے وہ ایٹم بم ہو یا۔۔۔۔

اب یہ ایک تاریخی سچائی کہ انگریزی حکومت کے زمانے میں جب ہندوستانی قوم غلام اور پس ماندہ تھی، سارے ملک میں اٹھارہ بڑے بڑے قحط پڑے تھے (میں کامن ویلتھ کے رشتے کا خیال کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قحطوں کا ذکر نہیں کروں گا) جن میں جان و مال کے نقصان کی سیدھی ذمہ داری انگریزی حکومت کی تھی اور ہے۔

ان قحطوں میں اڑیسہ کی ایک تہائی آبادی اور بہار کی ایک چوتھائی آبادی ختم ہو گئی۔

پچھلی جنگ عظیم کے دنوں میں بنگال کے قحط میں پینتیس لاکھ بنگالی موت کا شکار ہو گئے۔

بھارت سرکار نے اس جان و مال کے نقصان کا اندازہ پچیس ملین کھرب پونڈ لگایا ہے۔

میں بھارت سرکار اور برٹس سرکار کی گہری دوستی اور بین الاقوامی بہبودی کو مد نظر رکھتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ آپ جلد از جلد حکم دیں گے کہ پچیس ملین کھرب پونڈ کی رقم چیک کے ذریعے ہندوستانی خزانے کو بھیج دیں گے۔

سنا ہے کہ ان خطوں کے بعد برٹش وزیروں کی ایک خاص بیٹھک بلائی گئی کارروائی کے دوران معلوم ہوا کہ نہ صرف بھارت سے بلکہ لنکا سے، پاکستان سے، برما سے، سنگاپور سے، بورنیو سے، چین سے، مصر سے، عراق سے، افریقہ سے، ویسٹ انڈیز سے اور دوسری ان تمام جگہوں جہاں برطانیہ کی حکومت رہ چکی ہے، ہزاروں خط اس سلسلے میں ملے ہیں ان میں سے ہر خط اسی قسم کے قرضے کے بارے میں ہے مگر جب ان رقموں کو جوڑا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر ہرجانہ کی کل رقم ادا کردی جائے تو مالی اعتبار سے انگلینڈ بالکل اسی جگہ پہنچ جائے گی جہاں وہ آج سے ٹھیک دوسو سال پہلے تھا۔

☆☆☆☆☆

پرانے خدا

متھرا کے ایک طرف جمنا اور تین طرف مندر، اس حدود اربعہ میں نائی، حلوائی، پانڈے، پجاری اور ہوٹل والے بستے ہیں جمنا اپنا رخ بدلتی رہتی ہے نئے نئے عالیشان مندر بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں لیکن متھرا کا حدود اربعہ وہی رہتا ہے، اس کی آبادی کی تشکیل اور تناسب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے پاتی۔ سوائے ان دنوں کے جب اشٹمی کا میلہ معلوم ہوتا ہے کرشن جی کے بھگت اپنے بھگوان کا جنم منانے کے لیے ہندوستان کے چاروں کونوں سے کھنچے چلے آتے ہیں ان دنوں کرشن جی کے بھگت متھرا پر یلغار بول دیتے ہیں اور مدراس سے، کراچی سے، رنگون سے، پشاور سے ہر سمت سے ریل گاڑیاں آتی ہیں اور متھرا کے اسٹیشن پر ہزاروں جاتری اگل دیتی ہیں۔ جاتری سمندر کی لہروں کی طرح بڑھتے چلے آتے ہیں اور مندروں، گھاٹوں، ہوٹلوں اور دھرم شالاؤں میں سما جاتے ہیں۔ متھرا میں کرشن بھگتوں کے استقبال کے لیے پندرہ بیس روز پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مندروں میں صفائی شروع ہوتی ہے۔ فرش دھلائے جاتے ہیں کلسوں پر دھات پالش چڑھایا جاتا ہے زرکار پنگوڑے اور جھولے سجائے جاتے ہیں دیواروں پر قلعی اور رنگ ہوتا ہے دروازوں پر گل بوٹے بنائے جاتے ہیں، دکانیں رادھا کشن جی مورتیوں سے سجائی جاتی ہیں حلوائی پوری کچوری کے لیے بناسپتی گھی کے ٹین اکٹھے کرتے ہیں ہوٹلوں کے کرائے دگنے بلکہ سہ گنے ہو جاتے ہیں۔ دھرم شالائیں چونکہ خیراتی ہوتی ہیں اس لیے ان کے مینیجر ایک کمرے کے لیے صرف

ایک روپیہ وصول کر سکتے ہیں کسان لوگ جوان خیراتی دھرم شالاؤں میں ٹھہرنے کی توفیق نہیں رکھتے، عموماً جمنا کے گھاٹ پر ہی سو رہتے ہیں گھاٹ چونکہ پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں، اس لیے گھاٹ کے منتظم وانے والے جاتریوں سے ایک آنا فی کس وصول کر لیتے ہیں اور اصل گھاٹ پر سونے کے لیے ایک آنے کا تاوان بہت کم ہے کنار جمنا ،سر پر کرم کی پرچھائیاں، جمنا کی لہروں کی میٹھی میٹھی لوریاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، تاروں بھرا آسمان اور مندروں کے چمکتے ہوئے کلس جب جی چاہا سو رہے۔ جب جی چاہا اٹھ کر جمنا میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ ایک آنے میں دو مزے، اس پر بھی بہت سے کسان لوگ گھاٹ کے غریب منتظموں کو ایک آنہ کرایہ بھی ادا نہیں کرنا چاہتے اور گھاٹ پر سو جاتے اور جمنا پر نہانے کے مزے مفت میں لوٹنا چاہتے تھے انسان کی فطری کمینگی۔۔۔۔

جنم اشٹمی سے دو روز پہلے میں متھرا میں آ پہنچا متھرا کے بازار، گلیاں اور مندر جاتریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور جاتریوں کے ریوڑوں کو مختلف مندروں میں داخل کر رہے تھے۔ ان جاتریوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ متھرا میں ہندوستان بھر کی بوڑھی عورتیں جمع ہوگئی ہیں، بوڑھی عورتیں مالا پھیرتی ہوئیں اور لاٹھی ٹیک کر چلتے ہوئے مرد۔۔۔۔ کھانستی ہوئی، گٹھیا کی ماری ہوئی، رعشہ بر اندام مخلوق جو یہاں اپنے گناہ بخشوانے کی امید میں آئی تھی جتنی بد صورت یہاں میں نے ایک گھنٹے کے عرصے میں دیکھ لی، اتنی شاید میں اپنی ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکتا۔ متھرا کا یہ احسان میں قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

متھرا پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے رہنے کے لیے جگہ تلاش کی،

ہوٹل والوں نے بالکونیاں تک کرایہ پر دے رکھی تھیں اور ان کی کھڑکیوں، دروازوں اور بالکونیوں پر جا بجا جاتریوں کی گیلی دھوتیاں ہلولیں لہراتی دکھائی دیتی تھیں۔ دھرم شالائیں جاتریوں سے بھڑ کے چھتوں کی طرح بھری ہوئی تھیں کوئی مندر بنگالیوں کے لیے وقف تھا تو کوئی مدراسیوں کے لیے، کسی دھرم شالا میں صرف نمبودری برہمنوں کے لیے جگہ تھی تو کسی میں صرف کاستھ ٹھہر سکتے تھے اس رائے میں اگر والوں کو ترجیح دی جاتی تھی تو دوسرے سرائے میں امرتسر کے ارڈرے ٹھہر سکتے تھے۔ ایک دھرم شالا میں ایک کمرہ خالی تھا میں نے ہاتھ جوڑ کر پانڈے جی سے کہا میں ہندو ہوں یہ دیکھیے ہاتھ پر میرا نام کھدا ہوا ہے اگر آپ انگریزی نہیں پڑھ سکتے تو چلیے بازار میں کسی سے پڑھوا لیجئے غریب جاتری ہوں اپنی دھرم شالا میں جگہ دے دیجئے آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

پانڈے جی کی آنکھیں غلافی تھیں اور بھنگ سے سرخ، جیسوا کا مقدس تاگا ننگے پیٹ پر لہرا رہا تھا کمر میں رام نام کی دھوتی تھی چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑے مجھے گھورتے رہے پھر گھگیائی ہوئی آواز میں جس میں پان کے چونے اور کتھے کے بلبلے اٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے بولے آپ کون ہو؟

میں نے جھلا کر کہا، میں انسان ہوں، ہندو ہوں، کالا شاہ کاکو سے آیا ہوں

ناں، ناں! پانڈے جی نے اپنا بایاں ہاتھ گوتم بدھ کی طرح اوپر اٹھاتے ہوئے کہا ہم پوچھت ہیں، آپ کون گوت ہو؟

گوت؟ میں رک کر کہا مجھے اپنی گوت تو یاد نہیں بہر حال کوئی گوت ضرور ہوگی آپ فی الحال اپنی دھرم شالا، اس خیراتی دھرم شالا میں رنے کے لیے جگہ دے

دیں، میں گھر پر تار دے کر اپنی گوت منگوالیتا ہوں۔

ناں، ناں! پانڈے جی نے پان کی پیک زور سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا ہم ایسو مانس کیسو راکھیں؟ نہ گوت نہ جات!

میں متھرا کے بازاروں میں گھوم رہا تھا فضا میں کچوریوں کی کڑوی بو جمنا کے مہین کیچڑ کی سڑاند اور بنا سپتی گھی کی گندی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی متھرا کی خاک جاتریوں کے قدموں میں تھی ان کے کپڑے میں تھی، ان کے سر کے بالوں میں، ناک کے نتھنوں میں، حلق میں، میرا دم گھٹا جاتا تھا اور جاتری شری کرشن مہاراج کی جے کے نعرے لگا رہے تھے میرا سر گھوم رہا تھا مجھے رہنے کے لیے ابھی تک کہیں جگہ نہ ملی تھی ایک پنواڑی کی دکان پر میں ایک خوش پوش رو نوجوان کو دیکھا کہ سر تا پا براق کھدر میں ملبوس، پان کلے میں دبائے کھڑا ہے آنکھوں اور چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں ہیں میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

مسٹر؟ میں نے اسے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا کیا مجھے جیل خانے کے سوا یہاں کوئی اور ایسی جگہ بتا سکتے ہیں جہاں ایک ایسا انسان جو ہندو ہو، پنجابی ہو، کالا شاہ کاکو سے آیا ہو اور جسے اپنی گوت کا علم نہ ہو، میلے دنوں میں اپنا سر چھپا سکے۔

نوجوان نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا، چند لمحوں کے لیے مجھے گھورتا رہا پھر مسکرا کر کہنے لگا آپ پنجابی ہیں نا! اسی لیے آپ یہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔۔معف کیجئے گا۔۔۔۔۔۔پنجابی

بڑے بدمعاش ہوتے ہیں یہاں سے لڑکیاں اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔

اور ان لڑکیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اس طرح اغوا ہو جاتی ہیں؟ میں نے پوچھا۔

''ایک دبلا پتلا آدمی جس کا قد بانس کی طرح لمبا تھا اور منہ چھچھوندر کا سا، کھدر پوش نوجوان کی تائید میں بولا بابو صاحب، آپ متھرا کی بات کیوں کرتے ہیں، متھرا تو پوتر نگری ہے میں بمبئی تک گھوم آیا ہوں، وہاں بھی پنجابیوں کو شریف محلوں میں کوئی گھسنے نہیں دیتا''

دو چار لوگ ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے، میں آستین چڑھاتے ہوئے کہا کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟

جی ہاں! خوش رو نوجوان نے پان چباتے ہوئے جواب دیا

تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کی عمل داری میں آیا اور چھوٹی بچیوں کو جان سے مار ڈالنے کی رسم جو ہندوستان کے صوبوں میں رائج تھی، پنجاب میں سب سے آخر میں خلاف قانون قرار دی گئی انگریزوں کے آنے سے پہلے شریف لوگ اکثر اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے

اس سے کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ پنجاب میں مردوں اور عورتوں کا تناسب 5-1 ہو گیا۔ پانچ مرد اور ایک عورت، اب بتایئے باقی چار مرد کہاں جائیں، مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر عورت ایک دم پانچ خاوند کر سکے، جیسا کہ تبت میں ہوتا ہے کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں

نوجوان ہنسنے لگا

میں نے کہا پنجاب میں لڑکیاں کم ہیں، پنجابیوں نے دوسرے صوبوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا، بنگال میں لڑکیاں زیادہ ہیں، وہاں لوگ ایک بیوی رکھتے ہیں اور ایک داشتہ جو عموماً ودھوا ہوتی ہے سندھی گجراتی مرد سمندر پار تجارت کے لیے جاتے ہیں اور اکثر گھروں سے کئی سال غائب رہتے ہیں اسی لیے سندھ میں ادم منڈلیاں بنتی ہیں اور گجرات میں بکری کے دودھ اور برہمچریہ کا پرچار ہوتا ہے مرض ایک ہے، نوعیت وہی ہے اب آپ ہی بتائیے کہ کون شریف ہے اور بدمعاش کون؟ جو حقیقت ہے آپ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتے الٹ پنجابیوں کو کوستے ہیں۔

نوجوان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسا پان گلے سے موری میں جا گرا، وہ میرے بازو میں بازو ڈال کر کہنے لگا ''آیئے صاحب میں آپ کو اپنے گھر لیے چلتا ہوں''

تھوڑے ہی عرصے میں ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن گئے۔ وہ ایک نوجوان وکیل تھا ایک کامیاب وکیل، اس کا ذہین چہرہ، فراخ ماتھا اور مضبوط ٹھوڑی اس کے عزم راسخ کی دلیل تھے وہ مدراسی برہمن تھا متھرا میں سب سے پہلے اس کا دادا آیا تھا۔ کہتے ہیں اس کے دادا کے کسی رشتہ دار نے جو مدراس میں ایک مندر کا پجاری تھا، کسی آدمی کو قتل کر دیا تھا، ٹھاکر جی کو ایک پجاری کے گناہ کے بار سے بچانے کے لیے میرے دوست کے دادا نے ایک رات کو مندر سے ٹھاکر جی کی مورتی کو اٹھا لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر مدراس چل دیا۔ سفر کرتے کرتے وہ متھرا آن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آتما کو سکون نصیب ہوا، اور اس نے ٹھاکر جی

کو ایک مندر میں ستھاپت کر دیا۔ آج اسی دادا کا پوتا میرے سامنے مندر کی دہلیز پر کھڑا تھا اور میں اس کے گٹھے ہوئے جسم اور چہرے کے تیکھے نقوش میں اس بوڑھے برہمن کے عزم اور اعتقاد کی جھلک دیکھ رہا تھا جس کی تصویر اس کی بیٹھک میں آویزاں تھی۔

نہا دھو کر اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم میلے کی سیر کو نکلے، جو گلی بازار سے وشرام گھاٹ کی طرف جاتی ہے اس میں سینکڑوں نائی بیٹھے استروں سے جاتریوں کے سر مونڈ رہے تھے گول گول چمکتے ہوئے، منڈھے ہوئے سر ان سپید چھتریوں کی دکھائی دیتے تھے جو برسات کے دنوں میں خود بخود اگ آتی ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان سپید سپید چھتریوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا جائے! اتنے میں ایک نائی نے میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار استرا گھمایا اور مسکرا کر بولا بابو جی سر منڈا لو، بڑا پن ہو گا میں نے اپنے دوست سے پوچھا یہ جاتری لوگ سر کیوں منڈاتے ہیں؟ کہنے لگا، دان پن کرنے کی خاطر، یہ لوگ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی روحوں کے لیے دان پن کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے سر منڈانا بہت ضروری ہے اور یہاں ایسا کون شخص ہے جس کا اب تک کوئی عزیز یا رشتے دار نہ مرا ہو۔ میں نے جواب دیا میری چندیا پر پہلے ہی تھوڑے سے بال ہیں میں انہیں حجام کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بال جو چندیا پر ہے ان بالوں سے کہیں بہتر ہے جو حجام کی مٹھی میں ہوں ہم لوگ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وشرام گھاٹ پہنچ گئے گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں اور لوگ ان پر بیٹھ کر جمنا جی کی سیر کے لیے جا رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک

کشتی لی اور تین گھنٹے تک جمنا میں گھومتے رہے۔ جن کے کنارے پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے کہیں کہیں مندروں اور دھرم شالاؤں کی چوبرجیاں اور کدم کے درخت نظر آ جاتے، ایک جگہ دریا کے کنارے ایک پرانے شکستہ محل کے بلند کنگرے نظر آئے، استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ اسے کنس محل کہتے ہیں، میں نے کہا تین چار سو سال سے پرانا معلوم نہیں ہوتا، کہنے لگا ہاں اسے کسی مرہٹہ سردار نے بنوایا تھا اب زود الاعتقاد لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اسی کنس کا محل ہے جس کے ظلموں کا خاتمہ کرنے کے لیے بھگوان نے جنم لیا تھا۔ میں نے پوچھا، کس زمانے میں ظلم نہیں ہوتے؟ وہ ہنس کر بولا اگر یہی پوچھنا تھا تو متھرا کیوں آئے۔۔۔۔۔وہ دیکھو ریل کا پل۔۔۔۔۔متھرا میں سب سے زیادہ خوبصورت شے یہی پل ہے مضبوط جید، بلند ریل گاڑی نہایت پرشکوہ انداز میں جمنا کے سینے کے اوپر دندناتی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ کرشن جی کے جنم دن کو جمنا فرط محبت سے امنڈی چلی آتی تھی اور جب تک اس نے کرشن جی کے قدم نہ چھو لیے اس کی لہروں کا طوفان ختم نہ ہوا۔ جمنا میں اب بھی طوفان آتے ہیں لیکن اس کی لہروں کی ہیجانی اس ریل گاڑی کے قدموں کو بھی نہیں چھو سکتی جو اس کی چھاتی پر دندناتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ جمنا کی سربلندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور وشرام گھاٹ پر آرتی اتاری جا رہی تھی۔ عورتیں رادھے شیام، رادھے شیام، رادھے شیام گاتی ہوئی جمنا میں نہا رہی تھیں سنگھ اور گھڑیال زور زور سے بج رہے تھے جاتری چڑھاوا چڑھا رہے تھے

اور جمنا میں پھل اور پھول پھینک رہے تھے پانڈے دکشنا سنبھالتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ آرتی اتارتے جاتے تھے۔ ایک پانڈے نے ایک غریب کسان کو گردن سے پکڑ کر گھاٹ سے باہر نکال دیا کیونکہ کسان کے پاس دکشنا کے پیسے نہ تھے شاید کسان سمجھتا تھا کہ بھگوان کی آرتی پیسوں کے بغیر بھی ہوسکتی ہے وشرام گھاٹ کی نچلی سیڑھیوں تک جمنا بہتی تھی، لیکن یہاں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھا اور اس کیچڑ میں سینکڑوں چھوٹے موٹے کچھوے کلبلا رہتے تھے اور مٹھائیاں اور پھل کھا رہے تھے ان کے ملائم مٹیالے جسم ان جاتریوں کی ننگی کھوپریوں کی طرح نظر آتے تھے جن کے بال نائیوں نے مونڈ کر صاف کر دیئے تھے۔ رادھے کرشن، رادھے کرشن جاتری چلا رہے تھے نو بیاہتا جوڑے کشتیوں میں بیٹھے ہوئے مٹی کے دیے روشن کر کے انہیں جمنا کے سینے پر بہا رہے تھے جن کے سینے پر اس قسم کے سینکڑوں دیے روشن ہو اٹھے تھے اور نو بیاہتا جوڑے مسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے بالکل قریب ہی ایک زرد رو نوجوان لڑکی نے مٹی کے دو دیے روشن کیے اور انہیں جمنا کے حوالے کر دیا۔ دیر تک وہاں کھڑی اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے ان دیئوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہم اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کی طرف دیکھتے رہے۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کا خاوند نہ تھا نہ وہ بیاہتا معلوم ہوتی تھی پھر ان جھملاتے ہوئے دیئوں کی لو کو کیوں اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔

یہ لرزتی ہوئی شمع محبت۔۔۔۔۔لڑکی نے یکا یک میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلی گئی

میرے دوست کے لب بھنچے ہوئے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، کیا جمنا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ محبت کے دو کانپتے شعلوں کو ہم آغوش ہو جانے دے، یہ دیواریں، یہ پانی کی دیواریں، پیسے کی دیواریں، سماج، ذات پات اور گوت کی دیواریں ۔۔۔۔۔۔!میرا دل غیر معمولی طور پر اداس ہوگیا اور میں نے سوچا کہ میں کل متھرا سے ضرور کہیں باہر چلا جاؤں گا برندابن میں یا شاید گوکل میں، جہاں کی شادہ اور پاک وصاف فضا میں میرے دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔

برندابن میں بن کم اور پکی گلیاں اور کھلی سڑکیں زیادہ تھیں، برندابن کے عالی شان مندروں کی وسعت اور عظمت پر محلوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ راجا مان سنگھ کا مندر، میرا کا مندر باہر کی عمارت میں کرشن جی کی مورتی موجود تھی، ہر جگہ پانڈے موجود تھے لیکن ایک بات میں برندابن متھرا سے بڑھا ہوا تھا برندابن میں گائیڈ بھی موجود تھے انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے گائیڈ، پہلے لوگ مندروں میں بے کھٹکے چلے جایا کرتے تھے اب بھگوان نے گائیڈ رکھ لیے تھے، خدا وہی پرانے تھے لیکن جدید مذہب کے سارے لوازمات سے بہرہ ور آخر یہ نئی تہذیب بھی تو انہیں کی بنائی ہوئی تھی۔

برندابن کے ایک مندر میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں سات آٹھ سو سادھو ہاتھ میں کھڑتالیں لیے ایک ساتھ گا رہے تھے، رادھے شیام، رادھے شیام ۔۔۔۔۔۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ ۔۔۔۔۔۔۔ باقاعدگی تنظیم، اندھاپن تہذیب اور طاقت کے ہزاروں راز اس رقت انگیز نظارے میں مستور تھے۔ ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاتری اس مندر میں آتے تھے اور بے

شمار چڑھاوا چڑھتا تھا، سنا ہے کہ اندھے سادھوؤں کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا، باقی جو منافع ہوتا، وہ ایک لحیم شحیم پانڈے کی تجوری میں چلا جاتا ایک اور مندر میں بھی میں نے ایسا ہی نظارہ دیکھا فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کے بجائے بے کس اور نادار عورتیں کشن بھگوان کی ستتی کر رہی تھیں۔ دن بھر استتی کرنے کے بعد انہیں بھی وہی راشن ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حصے میں آتا تھا۔ یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا، اندھے سادھوؤں اور عورتوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے وشرام گھاٹ کے جاتری اور جمنا کے کیچڑ میں کلبلاتے کچھوے یاد آ گئے، مذہب نے مندروں میں فیکٹریاں کھول رکھی تھیں اور بھگوان کو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط سلاخوں کے اندر بند کر دیا تھا، ہر مندر میں ایک جاتری کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ بعض دفعہ تو ایک ہی مندر میں مختلف جگہوں پر دکشنا ریٹ مختلف تھا، سیڑھیوں کو چھونے کے لیے ایک آنہ، مندر کی چوکھٹ تک آنے کے لیے چار آنے مندر کا کواڑ اکثر بند رہتا تھا اور ایک روپیہ دے کر جاتری مندر کے کواڑ کھول کر بھگوان کے درشن کر سکتا، کئی ایک مندر ایسے تھے جو سال میں صرف ایک بار کھلتے تھے اور کوئی بڑا سیٹھ ہی ان کی ''بوہنی'' کر سکتا تھا اور بہت سا روپیہ ادا کر کے مندر کے کواڑ کھول سکتا تھا۔ طوائفیت ہمارے سماج کا کتنا ضروری جزو ہے، اس بات کا احساس مجھے ایسے مندروں ہی کو دیکھ کر ہوا۔

گوکل میں جمنا کے کنارے تین عورتیں ریت پر بیٹھی رو رہی تھیں، مارواڑ سے کرشن بھگوان کے درشن کرنے کو آئی تھیں، زیوروں میں لدی پھندی، ایک سادھو

مہاتما نے انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسالیا اور گیان دھیان کی باتیں کرتے کرتے انہیں مختلف مندروں میں لیے پھرے اور جب مارواڑی عورتیں گوکل میں مارکھن چور کنھیا کا گھر دیکھنے آئیں تو یہ مہاتما بھی ان کے ہمراہ ہو لیے، عورتیں جمنا میں اشنان کر رہی تھیں اور سادھو کنارے پر ان کے زیوروں اور کپڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا، جب عورتیں نہا دھو کر گھاٹ سے باہر نکلیں تو مہاتما جی غائب تھے، عورتیں سر پیٹنے لگیں، کرشن جی اگر ماکھن چراتے تھے تو سادھو مہاتما نے اگر چند زیور چرا لیے تو کون سا برا کام کیا لیکن مہاتما کی یہ تک ان بے وقوف عورتوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور وہ جمنا کی گیلی ریت پر بیٹھی مہاتما جی کو گالیاں دے رہی تھیں بہت سے لوگ ان کے آس پاس کھڑے تھے اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے

"جی بڑا ظلم ہوا ہے ان غریب عورتوں کے ساتھ۔۔۔۔"

"بھلا یہ گھر سے زیور لے کر ہی کیوں آئیں؟"

"اپنی امارت دکھانا چاہتی تھیں، اب رونا کس بات کا۔۔۔۔"

"اجی صاحب شکر کیجئے ان کی جان بچ گئی، اب کل ہی متھرا میں ایک پانڈے نے اپنے جَجمان اور اس کی بیوی کو اپنے گھر لے جا کر قتل کر دیا۔ ججمان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا بیوی کے پاس ساٹھ ستر ہزار کا زیور تھا۔۔۔۔۔۔ کسی مدراسی جاگیردار کا لڑکا تھا جی، اکلوتا لڑکا۔۔۔۔۔ اس کے باپ نے پولیس کو تار دیا ہے خیال تو کیجئے کیسا اندھیر مچ رہا ہے اس پوتر نگری میں"

"متھرا میں لوک سے نیاری!"

بہت رات گئے میں اور میرا دوست جمنا کے اس پار کھیتوں میں گھومتے رہے، جنم اشٹمی کی رات تھی، پھونس کے جھونپڑوں میں جن میں غریب مزدور اور کسان رہتے تھے مٹی کے دیے روشن تھے اور جمنا کے دوسرے کنارے گھاٹوں پر بجلی کے قمقمے اور برہمنوں کے قہقہوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں پھونس کے جھونپڑوں کے باہر مریل سی فاقہ زدہ گائیں بندھی تھیں اور نیم برہنہ لڑکے خاک میں کھیل رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر ایک بوڑھی عورت آہستہ آہستہ ڈول کھینچ رہی تھی۔ دو بڑی بڑی گاگریں اس کے پاس پڑی تھیں۔ کنویں سے آگے آم کے درختوں کی قطار تھی جو بہت دور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی تھی آم کے درخت اور آنولے کے پیڑ اور کھرنی کے مدور چھتنارے، یہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا ہوا میں ایک ہلکی اداس سی خوشبو تھی اور ستاروں کی روشنی ایسی جس میں سپیدی کے بجائے سیاہی زیادہ گھلی ہوئی تھی جیسے یہ روشنی کھل کر ہنسنا چاہتی ہے، لیکن شام کی اداسی دیکھ کر رک جاتی ہے۔

میرے دوست نے آہستہ سے کہا، میں اور وہ کئی بار ان کھرنی کے مدور سایوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھومتے رہے ہیں۔۔۔۔ کتنی ہی جنم اشٹمیاں اس طرح گزر گئیں۔۔۔۔ اور آج۔۔۔۔!

میں خاموش رہا

چند دن ہوئے میرا دوست کہہ رہا تھا مجھے ایک قتل کے مقدمے میں پیش ہونا پڑا، قاتل کو مقتول کی بیوی سے محبت تھی۔۔۔۔ اور جب اسے پھانسی کا حکم سنایا گیا تو قاتل کسان نے جن حسرت بھری نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا ان

نگاہوں کی وارفتگی اور گرسنگی ابھی تک میرے دل میں تیر کی طرح چبھی جاتی ہے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے سالہا سال ایک دوسرے سے پیار کرتے رہے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ نے اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی۔۔۔۔۔ یہ جمنا پر لوگ محبت کے دیے کس لیے جلاتے ہیں؟۔۔۔۔۔ بڑے ہو کر اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے گلے پر کس طرح چھری چلاتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ کسان عورت اب پاگل خانے میں ہے۔۔۔؟

میں نے کہا محبت بھی اکثر بے وفا ہوتی ہے رادھا کو کرشن سے عشق تھا لیکن رادھا اور کرشن کے درمیان بادشاہت کی دیوار آ گئی، اس نے کہا شاید تمہیں رادھا اور کرشن کی محبت کا انجام معلوم نہیں۔

"نہیں" وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر آہستہ سے کہنے لگا۔۔۔۔۔ آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے

۔۔۔۔۔ زندگی سے پرے، موت سے پرے، انصاف سے پرے۔۔۔۔۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا دوست اپنی بانہوں میں سر چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔ جیسے کسی نے اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو۔ جیسے پاگل عورت محبت کرنے کے جرم میں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دی گئی ہو۔ زرد رو لڑکی وشرام گھاٹ پر حسرت بھری نگاہوں سے مٹی کے دیئوں کی لو کی طرف تک رہی تھی اس کی حیران پتلیاں میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں۔ اندھے

سادھو سر منڈائے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور کھڑتالیں بجاتے ہوئے گا رہے تھے رادھے شیام، رادھے شیام۔۔۔۔۔لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ پرانے خدا ابھی مندروں، بینکوں، فیکٹریوں اور کھیتوں پر قبضہ کیے بیٹھے تھے، وہ اپنے ہی کھاتے کھالے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ان کی ننگی توندوں پر جینو لہرا رہے تھے اور وہ نہایت دلجمعی سے ان لاکھوں آوازوں کو سن رہے تھے، جو فضا میں چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔۔۔رادے شیام۔۔۔۔۔۔۔رادے شیام۔۔۔۔۔۔کرشن جی نے برندابن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ ایک بار پھر برندابن میں آئیں گے اور ہر ایک گوپی کے گھر کا دروازہ تین بار کھٹکھٹائیں گے جس گھر میں روشنی ہوگی اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کا خیر مقدم کرے گی، وہ اسی کے عشق کو سچا جانیں گے۔۔۔اس بات کو کئی برس گزر گئے۔

ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ کسی نے برندابن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا اجنبی ایک مکان پر تین بار دستک دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔۔۔لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا سب لوگ سوئے پڑے تھے، کسی نے اٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔

اجنبی نا امید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دور ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے وہ اس جھونپڑے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا لیکن اس دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی کیونکہ دروازہ کھلا تھا

جھونپڑے کے اندر دیے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے چہرے پر لاتعداد جھریاں۔

کرشن جی گلوگیر آواز میں کہا ''رادھا میں آ گیا ہوں''

لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی دیے کی لو کی طرف تکتی ہوئی

رادھا میں آ گیا ہوں کرشن جی نے چلا کر کہا

لیکن رادھا نے کچھ نہ دیکھا نہ سنا اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اس کی۔

☆☆☆☆☆

All rights reserved. ©2002-2006

پرہیز

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال اپنا توازن برقرار رکھتی ہے ہم نے زکام و نزلہ، بخار اور نمونیا کے لیے پنسلین ایجاد کی تو قدرت نے پنسلین کو مہلک بنا دیا، اب اتنے لوگ نمونیا سے نہیں مرتے جتنے پنسلین سے مرتے ہیں۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کرکے عالمگیر پیانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار کر گیا ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کرلیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا جسے دیکھیے اپنے سینے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا سہا دکھائی دیتا ہے میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل بیماری کی میں صرف آہ و بکا کی جاتی تھی اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضی رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے اس لیے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و محن کو کبھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دو ہمیشہ خوش رہا کرو، اس لیے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہا، احباب تعزیت کو آتے رہے مگر میں مسکراتا رہا، نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا پھر چھ مہینے بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لیے ایک پکچر ہاؤس میں ایک عربیہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے لگا، میری بیوی نے سمجھا کہ شاید میں پاگل ہو چکا ہوں مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں

پاگل نہیں ہوں محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لیے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس نے پاگل خانے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی مگر میں دیکھ رہا تھا وہ ایمبولینس واپس کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آئی۔

فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً ہارٹ اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے اپنا وزن گھٹا دو! مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے کیونکہ میں نے سنا ہے، مجنوں لیلیٰ کے مر جانے کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا۔ میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن اتنا کم تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست احباب محض ایک پھونک مار کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔

ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دور دریا میں گر پڑا مگر ڈوب نہ سکا کیونکہ اس کا وزن پانی سے کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری اور وہ واپس اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریباں ہمیشہ چاک رہتا تھا کیونکہ اس کا تن ناتواں کپڑوں کا بوجھ نہ سہار سکتا تھا۔ لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہا۔۔۔۔ ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر سیال بن کر اس کے جسم نکل گیا۔ اس لیے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مر جانے کی سوچی دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا

کانٹے لٹکا رہا۔ مگر اس کی جان نہ نکلی کیونکہ اس کا وزن دھاگے اور کانٹے دونوں سے کم تھا پھر ایک دن ایک لڑکے نے اس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا، جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکی کیونکہ ہضم کرنے کے لیے وزن چاہیے اس لیے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اگل دیا گیا لوگ بھاگ کہتے ہیں مگر میں نہیں جانتا خدا جانے کہاں تک سچ ہے مگر سبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے کچھ لوگوں کو دیکھ کر بھی یہی گمان ہوتا ہے اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو، اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے دوسرے عوارض اس پر اس لیے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کر کے ملے گا کیا؟ اس لیے درازی عمر کی دعا کرنے سے بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹا لیا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا ہے پہلے یہ خیال عام تھا اب یہ خیال خام ہے اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہو گی، اس گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے تو ایسا باورچی یا بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو اس لیے آج کل طلاق عام ہو رہی ہے اور پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کر کے اپنے شوہر کو کھلانا

بیویوں کی خامیوں اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمے کی روداد پڑھی جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا تھا تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کر کے کھلاتی تھی! عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید با مشقت کی سزا سنادی ہے کیونکہ ملزمہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتہ میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی تا کہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وزن بڑھنے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلد ہی مر جائے۔لیکن آج کل کے جج عاقل و دانش مند ہوتے جا رہے ہیں پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی اب سنا ہے کہ عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے اس قسم کا وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹری رائے بھی لیتی ہے اور اس ناطق سمجھا جاتا ہے سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے، اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اسے فوراً پھانسی دے دی جائے! لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا وزن دراصل غذا میں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے، جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بنتے جاتے ہیں اس لیے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھایئے نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں اصل روٹی سے بھی ڈبل ہوتا ہے اس لیے اسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے روٹی سے اجتناب کیجئے پہلے زمانے میں لوگ

روٹی کے لیے تگ و دو کرتے تھے اور دونوں کو حاصل کر کے موٹے ہو کر مر جاتے تھے اب صروف روزی کے لیے تگ و دو کیجئے اور روٹی کو بالکل بھول جایئے نشاستہ اس لیے بھی برا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں جا کر ایک کیمیائی عمل سے شکر میں تبدیل ہو جتا ہے شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی ہے جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہو گا اس کا مجھے علم نہ تھا آج سے چائے میں شکر بند، مٹھائی بھی بند اور آئس کریم بھی ختم۔

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے کیونکہ اس میں وہ اجزاء ہوتے ہیں جو گوشت بناتے ہیں اس لیے زندہ رہنے کے پروٹین کو بھی کم کرنا ہو گا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے سفید گوشت میں پروٹین البتہ کم ہوتی ہے، جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم نہیں آتی اس لیے اگر آپ کی تنخواہ دوسو پچاس روپے ہے تو اس میں سے دوسو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجئے اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجئے اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی فرض کیجئے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچیے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتے داروں کا بھلا ہو گا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے گٹھیا کا عارضہ جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج جاتے ہیں یہ ابتدا ہے دل کے دورے کی اور گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی جسم کا اندرونی نظام جسے انگریزی میں مٹابولزم کہتے ہیں آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے وہ دالیں، مٹر، پھلیاں، سرخ گوشت

وغیرہ یاد رکھئے کہ آپ شکر بند کر چکے ہیں، دودھ مکھن آپ پر حرام ہے اب سب طرح کی دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو پھر آپ کیا کھائیں گے؟ غم کھانے کی ضرورت نہیں، آرام اور اطمینان سے سوچیے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھایئے اور رات پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجئے بہتر یہ ہوگا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجیے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجئے دن کو لوکی، رات کو ساگ اے میری موت دور بھاگ اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجئے اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجئے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اس لیے نمک بھی مت ملایئے، اس کی جگہ سنگترے کا رس ملا لیجئے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اس لیے نمک بھی مت ملایئے، اس کی جگہ سنگترے کا رس پانی میں ڈال کر دیجیے ہر اکیس دن کے فاقے کے بعد گاندھی جی یہی کیا کرتے تھے پانی اور سنگترے کا رس بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق رہا ہے لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے اس لیے میں نے وزن گھٹانے کے لیے نشاستہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی جن میں نشاستہ ہوتا ہے پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کیا آئس کریم کو چھونے سے انکار کیا سرخ گوشت سے پرہیز، آلو، مٹر پھلی والی بھاجی، آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چھچے اورنج جوس پر آ گیا۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے مشین پر لا کھڑا کیا تو معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی۔ سٹیتھیسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا ''کیا کھاتے رہتے ہو؟''

میں نے کہا ''پانی میں تھوڑا سا اورنج جوس ڈال کر پیتا ہوں''

''یہی تو خرابی ہے تم میں'' ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا، وزن بڑھ گیا ہے سنگترے کا رس میں بڑے قوی اجزاء ہوتے ہیں میرے خیال میں تم صرف پانی پیو ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے اگلے ہفتے آنا۔

گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی پی کر جیا کروں گا صبح ناشتے میں ایک کپ پانی، لنچ پر ایک گلاس پانی، رات کو دو گلاس پانی، ایک ہفتے میں آپ ہی آپ وزن کم ہو جائے گا بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا بولا ''تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا پیا، سچ سچ بتاؤ''

''مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں''

''پانی کا گلاس صاف ستھرا تھا'' ڈاکٹر نے پوچھا

''جی ہاں سوڈے سے دھلوایا تھا'' میں نے کہا ہمیشہ دھلواتا ہوں اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں

''پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا

میں نے کہا جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے نل کھولیے تو کبھی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے کبھی گھونگھے، کبھی چوہے، کبھی کیکڑے، ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو

تو آئندہ پانی چھان کر پیجیے' ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا ''سولہ روپے نکالو میری فیس کے''

میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آ کر بیوی نے کہا کہ وہ میرے لیے کھڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے، چکن، ریشمی کباب، تیتر کے تکے، قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم، رات کو سونے سے پہلے بالائی والے دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوہارے بھی پڑے ہوں

بیوی نے گھبرا کر کہا تمہارا کیا ارادہ ہے اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے ہی بڑھ چکا ہے اب صرف چھنا ہوا پانی پیو بلکہ ابال کر پیو'' میں نے کہا مرنا تو ہر حال میں ہے، جیسے میں کہتا ہوں ویسے کرو'' دوسرے دن میں نے اس سے کہا''

آج کے مینو میں تندوری مرغ تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائتہ اور آلو کے پراٹھے اور بعد میں بنارس حلوائی والے ہاں کے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ، ادھر کھانے میں اصلی گھی استعمال ہو۔ ورنہ تازہ مکھن، سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب ڈٹ کر کھایا بیوی **مسلسل** احتجاج کرتی رہی اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ جلد کوئی بری خبر سننے کے لیے تیار رہیں اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا چکتا کر لیں ورنہ بعد میں وہ اس کی ذمہ دار نہ ہوں گی سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پاؤنڈ کم ہو گیا تھا۔''

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا ''میں کہتا نہ تھا موٹا کرنے والی وزن بڑھانے والی تمام اشیا چھوڑ دو، تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا دیکھا آج وزن بارہ پونڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے جو احتیاط و پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے نکالو بتیس روپے''

☆☆☆☆☆

پل

وہ ڈھلوان سڑک پر چہل قدمی کرتا ہوا خوش باش جوڑوں سے بہت آگے نکل گیا، راستے میں اسے ایک ادھیڑ عمر کی عورت ملی جو ایک لمبی نوجوان عورت کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھی ہر شام چہل قدمی کرتے ہوئے اسے یہ دونوں عورتیں سڑک کے اسی حصہ پر مل جاتی تھیں وہ اکثر پلکیں اٹھا کر لمبی نوجوان عورت کے تیکھے ابروؤں کے قریب اپنی نگاہیں جما دیتا۔ حتیٰ کہ معمر عورت کے گنجان ابروؤں پر بل آ جاتے اور لمبی عورت اپنا سر جھکا لیتی اور اسے اس کے آراستہ بال، سیدھی مانگ اور لمبے اوورکوٹ کے سموری کالر کے قریب گندھا ہوا جوڑ نظر آ جاتا۔ جس پر کبھی کبھی بنفشے کے پھولوں کا گچھا ٹکا ہوتا۔ بنفشے کے پھول اسے بہت اچھے لگتے تھے ان کی شرمیلی نگاہیں اور گلابی معصومیت۔۔۔۔۔اور وہ اپنی استحسان آمیز نگاہوں میں ہمیشہ اس کے سلجھے ہوئے مذاق کی داد کو شامل کر دیتا۔ لیکن لمبی عورت مسکرا نہ سکتی تھی نہ اس کے چہرے پر وہ شفقی رنگ آتا جو بے باک نگاہوں کے مس سے نوجوان عورتوں کے چہروں پر آ جایا کرتا ہے وہ غازہ استعمال کرتی تھی اور اس کے ہونٹوں کی لطیف تراش پر ہمیشہ ایک غیر قدرتی سرخی کی چمک دکھائی دیتی تھی، قریب سے بھی رنگ و روغن کی ایک گڑیا نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ کوئی مرد نہ ہوتا۔ بلکہ وہ ادھیڑ عمر کی عورت وہ انہیں ہر شام سڑک اس حصہ پر چہل قدمی کرتا ہوا دیکھتا تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے وقت وہ نہایت دلچسپ انداز سے اپنا سوال نوجوان عورت سے پوچھ لیتا۔ لیکن نوجوان عورت بجز اپنے سر کو جھکا لینے کے اس

کی مستفسرانہ نگاہوں کا کوئی جواب نہ دے سکتی تھی۔۔۔۔اور پھر اس معمر عورت کے گنجان ابروؤں کے ٹیڑھے بل، وہ جلد جلد ان کے قریب سے گزر گیا آج غازہ مدھم تھا اور سرخی تیز اور داہنے رخسار پر ایک مدھم سی لکیر دکھائی دیتی تھی۔ پتلی کمر کی لچک زیادہ گہری تھی اور ٹانگیں گھوم گھوم کر چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں اس نے سوچا، شاید وہ بیمار ہے، کوئی خطرناک جنسی بیماری اور پھر اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں۔ خوش باش جوڑے ہنستے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔سڑک کا یہ حصہ ہمیشہ سنسان ہوتا تھا۔ ریاڑ کے درخت سبز چھتناروں کو لیے کہیں کہیں اکیلے کھڑے تھے۔سڑک کے کنارے ایک طرف لال جھنڈی لگی ہوئی تھی،سڑک کا یہ حصہ نیا نیا بنا تھا۔لال جھنڈی خطرے کا اشارہ،کوئی خطرناک جنسی بیماری اور اب اس کے دل میں تمام جزئیات ایک جگہ نقش ہوگئیں۔اس نے دل میں کہا ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے اس کی افسردگی معمر عورت کے ٹیڑھے ابرو،سر کو جھکا لینے کا انداز مجبوری اور ٹانگوں کا گھوم گھوم کر چلنا، وہ یقیناً بیمار ہے لیکن بنفشے کے پھول،شریف خاندان کی عورت معلوم ہوتی ہے شریف اور امیر اور پھر اس نے سوچا کہ یہی دو چیزیں تو بدمعاشی کی اساس ہیں ایک بھورے رنگ کا ٹٹو دلکی چال چلتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔سوار ایک یورپین مرد تھا خاکی قمیض میں اس کے گلے کا سرخ پھلبہری کا بڑا داغ معلوم ہو رہا تھا یہ لوگ بہت زیادہ کھاتے ہیں اور پیتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ، اور آج تو خود اس کے پاس صرف ایک روپیہ تھا اور اس کا منی آرڈر جس کی وہ ہر روز توقع کرتا تھا ابھی تک نہ آیا تھا یکایک اس کے دل میں تمام دنیا کے غریبوں کے لیے جذبہ ترحم پیدا ہو گیا اور اسے سرخ رنگ کی پھلبہری اور معمر عورت کے ٹیڑھے

ابروؤں سے سخت نفرت پیدا ہوگئی، کمینے۔۔۔۔۔۔کتے۔۔۔۔۔۔ڈاکو۔۔۔۔شخصی جائیداد۔۔۔وہ ٹٹو، بھورے رنگ کا ٹٹو ''کسی غریب'' ہاتو کا تھا لیکن وہ یورپین اسے اس طرح دلکی پر چلا رہا تھا اور اس کی کمر میں اس طرح ٹھوکے دیئے جا رہا تھا، گویا وہ اس کا اپنا زرخرید ٹٹو تھا اور ادھیڑ عمر کی عورت لمبی عورت کو لیے اس طرح چل رہی تھی، گویا وہ اس کی شخصی جائیداد ہو، اس نے سوچا، ہوگی اور پھر اس نے اپنی جیب میں ایک روپے کی نقدی کو جھنجھنایا، شخصی جائیداد۔۔۔۔۔۔

سورج کے بعد اب شفق بھاگی جا رہی تھی سڑک کے اگلے موڑ پر اسے لدر کا تیز بہاؤ نظر آیا، پانی کا سفید جھاگ شفق کے رنگ میں مل کر بنفشی ہوگیا تھا اور پانی شور مچاتا ہوا ایک لکڑی کے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا پل نیا نیا تھا اسے پل سونے کا بنا ہوا معلوم ہونے لگا اور سڑک کے قریب ایک ڈھلوان سے گزر کر پل پر چلا گیا۔ پل کے قریب ایک بوڑھا کشمیری جس کا سر گنجا تھا اور کنپٹیوں پر سفید بال ایک میلی ٹوکری میں بٹنگ کے پھل رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا بٹنگ پیلے اور موٹے تھے، اور زرد زرد چھلکوں کے اندر میٹھا رس جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک آنہ کے بٹنگ لے لیے اور ایک بٹنگ منہ میں ڈال کر اور باقی جیب میں رکھ کر وہ پل کے جنگلے کی طرف کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ پانی تیزی سے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا اور بلویا ہوا جھاگ سفید اور بنفشی رنگوں کے درمیان کانپتا ہوا معلوم ہوتا تھا وہ چند لمحوں کے لیے نیچے سے گزرتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا اور پھر یکا یک اسے پل اوپر کی طرف اٹھتا ہوا معلوم ہوا، پل ہوا میں پانی کے اوپر اڑ رہا تھا، نہایت تیز اور وہ اس لکڑی کے اڑن کھٹولے میں بیٹھا ہوا اس انوکھی اڑان کے

مزے لینے لگا بٹن میٹھے تھے، اور پل کی اڑان بہت دلفریب ، پل کے قریب بیٹھا ہوا "بوڑھا ہاتو" اسے حقیر کیڑے کی طرح دکھائی دیا۔ وہ غالباً صبح سے اسی پل کے کنارے بیٹھا تھا اور اس نے ابھی تک اس ہوائی سیر کا لطف نہ اٹھایا تھا۔ بچارا غریب، انجان ہاتو۔۔۔۔لیکن انجان ہاتو اتنا غریب نہ تھا اس نے آج ایک آنہ حاصل کر لیا تھا۔۔۔آج اسے بھی ایک آنہ حاصل ہوا تھا اور وہ صبح سے لے کر اب تک اسی پل کے کنارے بٹنگ بیچنے کے لیے بیٹھا تھا۔ یہ جان کر اسے ہاتو کے صبر پر بہت حیرت ہوئی ،صرف ایک آنہ،لیکن اب اس کی جیب میں بھی تو صرف پندرہ آنے تھے اور شاید کل اس کا منی آرڈر آ جائے، اسے یہ ہوائی سیر بہت دلچسپ معلوم ہوئی وہ ایک اڑتے ہوئے پل پر بیٹھا تھا جو لدر کے پانیوں پر اڑا جا رہا تھا اور اسے جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ کوئی بھی تو اس کی طرف حیران نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ چند لڑکے ٹٹوؤں پر سوار چابک لگاتے ہوئے اوپر سڑک سے گزر گئے اور انہوں نے اس معجزہ کو نہ دیکھا بے وقوف لڑکے،بس یہاں پہلگام میں ٹٹوؤں کے مالک تیز تیز قدموں سے بھاگے جا رہے تھے ٹٹو کی سواری دو آنے فی گھنٹہ،ٹٹو بھی دوڑاؤ اور ہاتو کو بھی ،ٹٹو کو بھی ٹٹو کے مالک کو بھی۔۔۔۔پسینہ میں شرابور گنجے ہاتو تیزی سے بھاگے جا رہے تھے دو آنے فی گھنٹہ،اس نے سوچا انسان اور ٹٹو میں کیا فرق ہے؟ اور اگر کوئی فرق ہے تو ہم نے اسے کیوں نہیں سمجھا۔۔۔۔اور اگر سمجھا ہے تو اس پر کب عمل ہو گا؟۔۔۔اور اس کے دل میں بیٹھے ایک چور نے کہا "کیا بک رہے ہو، بٹنگ کھاؤ، پیلے اور میٹھے بٹنگ، اور اس سنہری پل کی سواری کرو" کتنی نفیس بات ہے اس نے سوچا اور جیب سے ایک

بٹنگ نکال کر کھانے لگا معاً اسے پل کے دوسری طرف ایک معمر آدمی چلتا ہوا نظر آیا۔کیا اسے بھی اس دلفریب اڑان کا لطف آ رہا تھا غالباً نہیں، کیونکہ اس معمر آدمی کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک محدب شیشہ تھا اور اس کے منہ پر ڈاڑھی تھی وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا

اس نے بوڑھے آدمی سے پوچھا ''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

بوڑھے آدمی نے کہا ''پروفیسر ردرفورڈ میں برٹش رائل سوسائٹی آف سائنس کا پریذیڈنٹ ہوں۔''

اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''بہت خوب! مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی'' اور پھر اس نے اپنی جیب سے ایک پیلا بٹنگ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا ''کھایئے!''

پروفیسر ردرفورڈ نے بٹنگ کو محدب شیشے کے اندر سے جھانکا اور پھر اسے واپس کر دیا اس نے کہا ''میں بٹنگ نہیں کھاؤں گا میں برٹش رائل سوسائٹی آف سائنس کا صدر۔۔۔۔۔''

'' بہت خوب۔۔۔۔۔۔۔خوب۔۔۔۔ہوں۔۔۔۔۔اچھا تو۔۔۔۔۔۔کہیے آپ کو اس ہوائی سیر کا بھی لطف آ رہا ہے یا نہیں، اس سنہری پل کو دیکھیے کس تیزی سے پانی کے اوپر اڑا جا رہا ہے ایک بحری طیارے کی۔۔۔۔۔''

بوڑھے پروفیسر نے ایک بوڑھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ اپنے محدب شیشے کے اندر سے پانی کے تیز بہاؤ کا جائزہ لینے لگا۔

پروفیسر نے محدب شیشے کے اندر سے جھانکتے ہوئے کہا ''تم بالکل انجان ہو، پل اڑا نہیں جا رہا بلکہ وہیں کھڑا ہے، یہ صرف پانی کا تیز بہاؤ ہے، جو پل کے نیچے سے گزر رہا ہے اسے ہم سائنسدان ''نظر کا دھوکا'' کہتے ہیں، نظر کے دھوکے اور نظری مرکز میں جو تعلق ہے، یہ ایک مادی چیز ہے اور۔۔۔۔۔۔''

''جھوٹ!'' معاً قریب سے ایک آواز آئی ''بالکل سفید جھوٹ''

اس نے مڑ کر دیکھا ایک لمبا خوبصورت آدمی اس کے قریب کھڑا تھا، وہ ایک خوبصورت گیروے رنگ کی دھوتی پہنے ہوئے تھا اس کا سینہ فراخ تھا اور ننگا اس کے سر پر بالوں کی سنہری جٹا تھی اور اس کی غلافی آنکھوں میں سے ایک عجیب سا نور چھن رہا تھا۔

اس نے پوچھا ''کیا سفید جھوٹ ہے؟''

لمبے خوبصورت آدمی نے جواب دیا ''یہ جو کچھ بھی پروفیسر ردرفورڈ کہہ رہے ہیں بالکل سفید جھوٹ ہے یہ پیلے بٹنگ، یہ غریب ہاتو۔۔۔۔یہ تیز پانی کا بہاؤ۔۔۔۔یہ سنہری پل۔۔۔یہ دنیا، ایک سفید جھوٹ ہے''

وہ بٹنگ کھاتے کھاتے بولا ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس دنیا پر سفید آدمیوں کی حکومت ہے اور اس اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ یہ دنیا بھی ایک ''سفید'' جھوٹ ہو لیکن۔۔۔۔''

پروفیسر ردرفورڈ نے بات کاٹ کر کہا ''تم اس جگہ پر بات نہیں کر سکتے، میں برٹش رائل سوسائٹی آف سائنس کا صدر ہوں اور یہ میرا فرض ہے کہ۔۔۔''

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے دراز قد خوبصورت آدمی سے پوچھا ''لیکن تم

ہو کون؟''

دراز قد آدمی نے اپنی نورانی آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں اور جواب دیا ''میں گوتم ہوں۔۔۔۔۔گوتم بدھ۔۔۔ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی''

اس نے جواب دیا ''بہت خوب! میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔۔۔۔۔لیجئے یہ بٹنگ کھائیے، خوب پیلے ہیں اور میٹھے وہ پل کے کنارے جو غریب ہاتو بیٹھے ہیں، اس سے خریدے ہیں۔''

''نہیں، نہیں'' گوتم نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا'' میں بٹنگ نہیں کھاتا۔۔۔۔۔یہ بٹنگ سب مایا ہے۔۔۔۔۔اور میں نے مایا کو ہمیشہ کے لیے تیاگ دیا ہے اور اگر تم نروان چاہتے ہو تو۔۔۔۔''

اس نے دراز قد آدمی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اوہ کتنی بھول ہوئی'' اور پھر اسے یک لخت یاد آیا کہ رات کا سماں ہے، اور وہ دراز قد خوبصورت آدمی شاہی محل کی ایک خواب گاہ میں اپنی سوئی ہوئی حسین بیوی اور ننھے معصوم بچے کو الوداع کہہ رہا ہے اس نے آہستہ سے گوتم بدھ سے پوچھا ''تمہاری بیوی کہاں ہے؟''

اور گوتم نے تنک کر کہا ''تمہیں یہ سوال کیوں سوجھا؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں پہلگام میں کیا خاک سیر کرنے کو آئے ہو، دیکھو دور سڑک پر خوش باش جوڑے ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے ہیں، ادھیڑ عمر جوڑے، نوجوان جوڑے، بوڑھے جوڑے۔۔۔۔یہاں صرف وہی شخص اپنی بیوی نہیں لاتے جن کی اپنی کوئی بیوی نہیں ہوتی یا جن کی بیویاں بیمار ہوتی ہیں۔۔۔بیمار۔۔۔کوئی خطرناک جنسی

بیماری۔۔۔‘‘اور یکا یک ایک افسردہ چہرہ دیکھا لبوں پر غیر قدرتی سرخی، جوڑے میں بنفشے کے پھول گندھے ہوئے اور ایک پتلی کمر جو ایک محور کے گرد گھومتی ہوئی معلوم ہوتی تھی،

محور۔۔۔دائرے۔۔گولائیاں۔۔۔۔زاویے۔۔۔۔۔نقطے۔۔۔عمود۔۔۔
نے کہا حسن جیومیٹری ہے۔۔۔۔۔

گوتم اس کا شانہ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا ’’میں نے یشودھا کو اس لیے تیاگ دیا کہ عورت کا پیار بھی مایا ہے، یہ سب دنیا مایا ہے اور مایا کے دائرے میں یشودھا محض ایک نقطہ تھی‘‘

پروفیسر ردرفورڈ نے بےصبری سے کہا ’’تم ایک نقطے کو کیا سمجھتے ہو۔۔۔نظری احساس سے شاید تم نقطے کو حقیر سمجھتے ہو۔لیکن سائنس کے نقطہ نگاہ سے نقطہ ایک لامتناہی دنیا ہے اچھا، میں۔۔۔۔تم یوں نہیں سمجھ سکو گے۔۔۔۔میں تمہیں اس محدب شیشے سے ایک تجربہ کر کے سمجھاتا ہوں کہ جب ایک نقطے پر سورج کی کرنیں جمع ہو جاتی ہیں تو کس طرح وہ نقطہ آگ کی دنیا بن جاتا ہے۔‘‘

گوتم نے دلجمعی کے ساتھ جواب دیا ’’جھوٹ بالکل جھوٹ، نروان کا راستہ الگ ہے اور اگر تم۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

معاً پل کے کنارے بیٹھا ہوا بوڑھا ہاتو چلانے لگا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو بوڑھے ہاتو کے قریب دو آدمی، میونسپل کمیٹی کے ملازم، اس کے قریب اسے بلند آواز میں جھڑک رہے تھے۔

ایک نے کہا ’’تمہارا لائسنس کہاں ہے؟‘‘ اور تم یہاں بغیر لائسنس حاصل کیے

میونسپل کمیٹی کی حدود کے اندر کیوں بٹنگ بیچ رہے ہو؟ دوسرے بوڑھے ہاتو کے ایک زور کی ٹھوکر لگائی ''رام زادے، گنجے۔۔۔بغیر لائسنس کے پھل بیچتا پھرتا ہے۔۔۔کیا یہ تیرے باپ کا **ملک** ہے۔''

بوڑھے ہاتو نے چلا کر کہا'' میرے اللہ ! مجھے معاف کر دو، بابا۔۔۔۔۔۔مجھے معلوم نہ تھا۔۔۔۔۔میں غریب آدمی ہوں۔۔۔۔میں اب پھر کبھی ایسا کام نہ کروں گا، میں کبھی پل کے کنارے دوبارہ نہ بیٹھوں گا۔۔۔۔۔۔۔خدا کے لیے مجھے معاف کر دو''

پہلے آدمی نے اسے ٹھوکر لگائی ''حرامی، کتے، سور کے بچے، اٹھ، اب کیا دیکھتا ہے؟ اٹھا ٹوکرا اور چل انسپکٹر صاحب کے پاس'' لیکن دوسرے آدمی کو بہت غصہ آ رہا تھا اس نے ٹوکرے کو اوندھا کر دیا اور سب بٹنگ دریا کے تیز بہاؤ میں گر تے گئے۔

''وہ دیکھو، وہ دیکھو'' اس نے پروفیسر ردرفورڈ اور گوتم کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ''دیکھو، اس بوڑھے غریب ہاتو پر ظلم ہو رہا ہے، میرے خدا!۔۔۔۔۔یہاں اس دنیا میں رہنے کے لیے بھی غریب آدمی کو لائسنس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے!۔۔۔لیکن تم کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ آؤ، اس بوڑھے ہاتو کو بچائیں۔۔۔۔آؤ۔۔۔آؤ۔۔۔۔۔''

لیکن یکا یک اس نے محسوس کیا کہ وہ لکڑی کے جامد پل پر اکیلا کھڑا ہے، شفق کی سرخی غائب ہو چکی تھی اور دو آدمی بوڑھے ہاتو کو پکڑے ہوئے لیے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

پورب دیس ہے دلی

جب اسٹیشن سے اترا تو کانوں کو طرح طرح کی آوازوں نے گھیر لیا

''کارونیشن ہوٹل!''

''پنجاب ہوٹل!''

''دلکش ہوٹل!''

''ریگل میں شرفا کے لیے خاص انتظام ہے''

''اسٹینڈرڈ چلیے گا صاحب کشادہ کمرے، باتھ روم الگ، فلش سسٹم، ایکسی لینٹ، ارینج منٹ۔''

یکا یک کسی نے سرگوشیانہ انداز میں کہا ''صاحب میری سنیے، آرام ہوٹل چلیے'' پھر میری طرف جھک کر کہنے لگا ''واللہ کیا بتاؤں، بڑے مزے کی جگہ ہے''

مجھے اس آواز کا انداز بہت پیارا معلوم ہوا، میں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا، چھدری ڈاڑھی، لبوں پر پان کی پیک، ایک آنکھ سے کانا، آدمی با مذاق معلوم ہوتا تھا، میں نے دل ہی دل میں سوچا، اس کے لہجے میں کس قدر تیقن ہے اور پھر کس قدر پر اسرار معلوم ہوتا ہے کہ مغلئی حرم سراؤں کی شان و شوکت کو آرام ہوٹل میں تازہ کر رہا ہے۔

مجھے کنوئیں میں گرتا دیکھ کر ایک آدمی نے روکنا چاہا ''صاحب آرام ہوٹل نہ جائیے، وہ بھی ہوٹل ہے کیا؟ صاحب اسے تو ''بے آرام'' ہوٹل کہنا چاہیے''

''بے آرام ہوٹل؟'' ریگل ہوٹل کا ایجنٹ چلایا اسے تو ''حرام ہوٹل'' کہنا

چاہیے حرام ہوٹل! کوئی شریف آدمی اس ہوٹل کے قریب سے گزرنا بھی پسند نہ کرے گا۔

جواب میں چھدری ڈاڑھی والا آدمی مسکرایا مجھے اس کی مسکراہٹ اس کی کافی آنکھ تک پھیلتی ہوئی دکھائی دی، یہ تبسم بجائے خود ایک مسکت جواب تھا اس کی پر اسرار کم آمیزی ریگل ہوٹل کے ایجنٹ کی لسانی سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئی۔

میں کنوئیں میں گر گیا

آرام ہوٹل کنواں ہی تو تھا، لیکن ایک اوندھا کنواں، کہتے ہیں کہ پہلے یہ ایک سیدھا کنواں تھا۔ لیکن غدر کے زمانے میں جب بہت سی سیدھی چیزیں الٹا دی گئی تھیں تو یہ بھی الٹ کر ''آرام ہوٹل'' بن گیا تھا اسٹیشن کے قریب ہی ایک تنگ سی گلی میں واقع تھا۔ تنگ سی سیڑھیاں، پانچ منزل اوپر چڑھتے جاؤ، یہ سیڑھیاں ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں، ہر ایک منزل کے چاروں طرف کمرے، دروازوں پر مٹیالی سی سرکیاں پڑی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی تھی، گہرا سناٹا، پانچویں منزل پر پہنچ کر چھدری ڈاڑھی والے آدمی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا بجلی کی بتی جگی، میں نے دیکھا ایک کشادہ کمرہ ہے۔ جس کے دروازے باہر گلی کی طرف بھی کھلتے ہیں اور اندر صحن کی جانب بھی، کمرے میں دو بھاری اور پرانے پلنگ بچھے تھے۔ ایک میز تھی جس کی آدمیوں کی طرح ٹانگیں تھیں، دو کرسیاں جن کی کمریں امتداد زمانہ نے توڑ دی تھیں۔ ایک شیشہ دیوار میں لگا ہوا تھا کونے پر سے ٹوٹ گیا تھا مجھے ایسا معلوم ہوا گویا شیشہ بھی ایک آنکھ سے کانا تھا اور میری طرف مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا ''یہ آرام ہوٹل ہے واللہ بڑے مزے کی جگہ ہے'' میں نے گردن موڑ کر

دیکھا تو کانا آدمی غائب تھا، خاموشی، گہرا سناٹا، وہ کانا کدھر غائب ہو گیا تھا۔ یہ کیسی جگہ ہے، میرے سارے جسم پر ایک پھریری سی آئی، میں نے بلند آواز میں کہا ''کوئی ہے؟'' اور میری آواز چند ثانیوں تک اس پانچ منزلہ عمارت میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ چند مُیالی سرکیاں مختلف منزلوں میں ہلیں اور پھر ساکن ہو کر رہ گئیں ''کوئی ہے؟'' میں نے پھر آواز دی۔

''فرمایئے کیا حکم ہے؟''

میں چونک گیا یکا یک کہیں سے خاموش قدموں سے یہ عورت آ گئی تھی میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی فربہ اندام، ہونٹ اور آنکھوں کے پپوٹے موٹے ٹھنگنی، ادھیڑ عمر، لیکن بناؤ سنگار کی شوقین میں نے خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''آپ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا

''میں اس ہوٹل کی مینجر ہوں'' اس نے پان چباتے ہوئے جواب دیا

''تو۔۔۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔'' میں نے گھبرا کر کہا ''کیا یہاں کوئی آدمی نہیں ہے اور وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ صاحب کہاں ہیں جو مجھے یہاں لائے تھے''

اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا ''آپ گھبرایئے نہیں، میں ابھی نوکر کو آپ کے پاس بھجوائے دیتی ہوں، وہ صاحب اسٹیشن کسی پر اور گاہک کو لانے کے لیے گئے ہیں۔ اس کمرے کا کرایہ ڈیڑھ روپیہ یومیہ ہے۔ پنکھے کے چار آنے الگ، میں ابھی نوکر کے ہات رسید بھیج دیتی ہوں اور ایک فارم بھی، آپ وہاں اپنا نام اور پتہ وغیرہ تحریر کر دیجیے''

یہ کہہ کر اس نے اپنے موٹے پپوٹے اٹھا کر مجھے سر سے پاؤں تک چند لمحوں کے لیے دیکھا، جیسے مکڑی اپنے جالے میں پھنسے ہوئے شکار کی طرف دیکھتی ہے پھر اس نے اپنی دھوتی کا پلو سنبھالا اور کولھے مٹکاتی ہوئی سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔

میں جب ٹائی اتارنے کے لیے شیشے کی طرف مڑا تو وہ اپنی کانی آنکھ جھپکا کر مجھے کہنے لگا ''ذری اس عورت سے بچ کر رہنا بڑی خون آشام معلوم ہوتی ہے۔''

سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی کوئی اوپر آ رہا تھا غالباً نوکر ہوگا ہاں نوکر ہی تھا نوکر بہت جلد پہچانے جاتے ہیں، برتن مانجھنے کی راکھ ہر وقت ان کے ہاتھوں میں لگی رہتی ہے کپڑے اگر صاف بھی ہوں تب بھی سالن کی بو ہر وقت ان میں رچی رہتی ہے، سر کے بال بڑھے ہوئے اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نوکر ہمیشہ کسی دوسرے شہر سے آتے ہیں۔ یعنی اگر دلی میں ہوں تو سہارنپور سے آئیں گے، الموڑے سے آئیں گے، لاہور سے آئیں گے لیکن دلی والے دلی میں ناک نہیں کٹوائیں گے، اگر آپ لاہور میں رہتے ہوں تو نوکر دلی کا ہوگا، کلو کا ہوگا، کابل کا ہوگا اور کہیں کا ہوگا لیکن لاہور کا نہ ہوگا بھلا اپنے گھر بیٹھ کر اپنی ناک کون کٹوائے گا اور یہ بات ہے بھی سچ، صدیوں کی غلامی میں وطن عزیز نے گو اور سب کچھ کھو دیا ہے لیکن ناک نہیں کھوئی وہ جوں کی توں سلامت ہے بلکہ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

جو نوکر مجھے ملا وہ الموڑے کا تھا، چوڑا سا ماتھا، منگولیائی نقش، چہرہ ہر وقت ہنستا ہوا۔ لیکن سامنے کے تین دانت غائب تھے۔ اس لیے میں اس کے ہنسنے اور رونے

میں امتیاز نہ کر سکتا تھا۔ یوں بھی غریب آدمیوں کے رونے اور ہنسنے کی حدیں بہت قریب قریب ہوتی ہیں، اس نے آتے ہی سلام کیا جس سے میری گردن میں غیر شعوری طور پر ایک خفیف سا تناؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔۔۔ کیونکہ میں متوسط طبقے کے سب سے نچلے درجے سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے آقا بننے کا خبط ہے۔ یہ خبط اکثر پورا بھی ہو جاتا ہے۔ جب کوئی نوکر یا کلرک پیشہ شخص مجھے جھک کر سلام کرتا ہے تو مجھے اپنے آقا ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے نوکر سے کہا:

''ہولڈآل سے بستر نکال کر پلنگ پر بچھا دو''

اس نے ایسا ہی کیا

''یہ کوٹ اس کھونٹی پر ٹانک دو''

''وہ تولیہ مجھے دے دو''

''یہ بوٹ پالش کر دو''

''اس شیشے کا رخ بدل دو''

''گلاس میں پانی ڈال دو''

حجامت سے فارغ ہو کر جب میں اٹھا اور صابن کی ڈبیا اور تیل کی بوتل اٹھا کر غسل خانے کی طرف چلا تو یکا یک تیل کی بوتل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری بوتل کا منہ ٹوٹ گیا اور تیل فرش پر بہنے لگا نوکر نے جلدی سے بوتل کو سنبھالا۔ اسی اثنا میں شیشے کا ایک ریزہ اس کی انگلی میں چبھ گیا اور انگلی سے لہو کی دھار بہنے لگی۔

میں نے دل میں کہا: ''جاہل، بدتمیز تیل میں لہو ملا کر میرے خوشبودار ہیئر آئل

کا ستیاناس کر دیا، گندہ، وحشی، حرامزادہ، پہاڑی بجو" پھر اس سے مخاطب ہو کر میں نے کہا "کیا تمہارے پاس کوئی خالی شیشی ہے"

نوکر اپنی تیل کی شیشی خالی کرالایا اور اس میں تیل انڈیل کر بوتل میرے ہات میں دے دی اب اس کی انگلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی، کسی پھٹے ہوئے رومال کا ایک گندہ سا چیتھڑا

دوپہر کے وقت، میرے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی، میں نے چند خط لکھ کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ یہ عورت آ گئی، پتلی چھریری، سپید ساڑھی کے کنارے پر دلفریب طاؤسی نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کلائیوں پر سبز چوڑیاں، مسکرا کر کہنے لگی "آپ کے پاس ماچس ہو گی"

میں ایک وقفہ کے لیے خاموش رہا

اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا لیکن وہ جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جیسے ان آنکھوں کو رات بھر نیند میسر نہیں ہوئی۔ ہونٹوں پر لپ سٹک کی ہلکی سی آرائش بھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہونٹ باسی اور خشک تھے جیسے لوگوں نے ان کا سارا رس چوس لیا ہو۔

وہ میرے قریب آ گئی سبز چوڑیوں کی جھنکار پیدا ہوئی آہستہ سے بولی "کیا میں اندر آ جاؤں۔"

میں نے کہا "میں سگریٹ نہیں پیتا" اور میں نے دروازہ بند کر دیا

جب میں جاگا، تو شام ہو چکی تھی۔ ہوٹل بھی جاگ اٹھا تھا۔ چاروں طرف اک ہنگامہ سا بپا تھا۔ کمروں پر پڑی ہوئی مَیلی سرکیاں بار بار ہلتی تھیں، کہیں شرابی گا رہے

تھے، کہیں ہارمونیم بج رہا تھا۔ ایک کمرے سے ایک کالج کا لونڈا رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے باہر نکلا، سرکی کے پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی ''اب کب آؤ گے؟'' کالج کے لونڈے نے کوئی جواب نہ دیا، نوکر چائے لے کر آ گیا میں چائے پینے بیٹھا تو کسی نچلی منزل سے ایک بلند چیخ سنائی دی، کسی مرد کی آواز تھی اور وہ کسی عورت سے پناہ مانگ رہا تھا جو اسے برابر پیٹے جا رہی تھی میں نے ہراساں ہو کر نوکر سے پوچھا ''یہ کیا معاملہ ہے؟'' وہ بولا ''حضور وہی سبز چوڑیوں والی عورت ہے جو دوپہر کو حضور سے ماچس مانگنے کے لیے آئی تھی'' نوکر کے منہ سے تین دانت غائب تھے اور اب وہ واقعی ہنس رہا تھا۔ میرا منہ لال ہو گیا میں نے کہا ''لیکن میں سگریٹ نہیں پیتا۔۔۔ اور اب کیا ہو رہا ہے؟'' نوکر نے جواب دیا جی ہاں حضور اب بات یہ ہے وہ عورت شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے خاوند کو پیٹ رہی ہے جو اس کا خاوند بھی ہے، دلال بھی اور ہوٹل کا ایجنٹ بھی۔

''اچھا، وہ کانا، چھدری ڈاڑھی والا، واللہ آرام ہوٹل بڑے مزے کی جگہ ہے''

میں نے نوکر سے کہا ''میں چائے پیتا ہوں تم اس عرصے میں میرا سامان باندھ دو''

''آپ یہاں سے چلے جائیں گے!'' نوکر نے حیران ہو کر پوچھا ''آپ کو یہاں کیا تکلیف ہے۔''

جب میں بل ادا کرنے لگا تو ہوٹل کی مینجر نے بھی پوچھا ''آپ کیوں جا رہے ہیں؟'' کیا آپ کو یہ جگہ پسند نہیں؟ اور وہ اپنی غلافی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ''جی ہاں میں جا رہا ہوں مجھے نیند کی ضرورت ہے، میں تھکا ہوا

ہوں آپ کے ہوٹل میں مجھے کوئی سونے نہیں دیتا''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی'' آپ بھی عجیب آدمی ہیں اجی صاحب کیا ہوٹل میں لوگ سونے کے لیے آتے ہیں؟''

میں ایک رشتہ دار کے ہاں قرول باغ چلا گیا ان کا باغ قرول باغ میں سب سے آخر میں تھا۔ اس کے پرے چٹیل میدان اور آس پاس چماروں کی جھونپڑیاں اسی لیے اس جگہ کو چمری کہتے تھے۔ دلی میں دو چمریاں اور بھی ہیں لیکن یہاں چمار نہیں بستے، بلکہ دفتروں کے بابو اور کلرک رہتے ہیں۔ گو روح ایک ہے لیکن قالب جدا جدا ہیں۔

یہ مکان بہت بڑا تھا تین حصے تھے ایک حصے میں خود مالک مکان رہتے تھے ایک حصہ خالی تھا۔ ایک حصے میں ایک کرایہ دار رہتا تھا پانی کے تین نل تھے اور چماریاں دن بھر یہاں سے پانی بھر کر لے جاتی تھیں۔ ننھی چھوکریاں، نوجوان بہوئیں اور بوڑھی مائیں چماروں کو میں دیکھا ہے گانے بجانے کا بہت شوق ہے اور جب کبھی فرصت ملے تو یہ لوگ جوتے بھی بناتے ہیں ورنہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے قرض خواہوں کے گھروں میں کام کرنے، گانے بجانے، لڑنے جھگڑنے اور اپنی لڑکیوں کی خرید وفروخت میں بسر کرتے ہیں یہ لوگ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی اور روپیہ ملے تو عیسائی بھی بن جاتے ہیں آخر نام میں دھرا ہی کیا ہے لیکن یہ لوگ ایک ہی بستی میں رہتے ہیں اور اگر جگہ نہ ملے تو ایک ہی جھونپڑی میں پچاس ساٹھ آدمی گزارا کر لیتے ہیں بلیک ہول قسم کی بستیاں میں نے ہر شہر میں دیکھی ہیں اور گو اب کلکتہ سے بلیک ہول مانومنٹ اٹھا دیا گیا ہے لیکن اس اقدام

سے ہندوستان کے چماروں کوکوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔

قرول باغ میں مجھے ایک چماری بہت پسند آئی دراصل ان معاملوں میں میرا مذاق بہت پرولیتاری واقع ہوا۔ اس کا نام تھا اجیا، اجیا دلآویز نام ہے، اجیا کا نکھرا ہوا رنگ، تیکھے خدوخال اور سنجیدہ چہرہ میرے جی کو بھا گیا، اور جب وہ پانی کے نل پر جھکی ہوئی پانی بھر رہی تھی تو اس کا سارا جسم کمان کی طرح کھنچا ہوا بے حد متناسب نظر آیا اور ٹخنوں پر پائل بجتی ہوئی سنائی دی میں صبح اس کے متعلق دیر تک سوچتا رہا دوپہر کو جب ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میرے رشتہ دار نے ایک بات کہہ کر میرا سب عشق ہرن کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اجیا ایک چمار دکاندار کی بیوی ہے اور ایک پنجابی کی داشتہ ہے جو کسی محکمے میں ساڑھے چار سو روپے پاتا ہے میں نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور سوچا کہ چلو ایک اور عشق سے جان بچی ایک نوجوان کی زندگی میں اگر اس کا دماغ صحیح اور دل اپنی جگہ پر ہے، کئی ایک اسی قسم کے ناکامیاب وقتی، بلکہ لمحاتی عشق آتے ہیں اور دوسرے ہی لمحوں میں آبگینوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس نوجوان کا دماغ صحیح نہیں اور دلی جذبات اس کے قابو میں نہیں تو وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ مثلاً وہ جی بھر کر ایک عورت سے، بلکہ پیٹ بھر کر عشق کرتا ہے، پھر اس سے شادی کر لیتا ہے، پھر اسے بچے پیدا کرتا ہے، پھر کلرکی کرتا ہے اور اسی دھن میں مر جاتا ہے کہ ہائے زندگی! ہائے زندگی!

اس دن قرول باغ میں فساد ہوتے ہوتے رک گیا بات یوں ہوئی کی اجیا کے خاوند کی رگ حمیت جو پھڑکی تو اس نے اجیا کو خوب پیٹا، اجیا گھر دیر سے آئی، اجیا نے کہا اس میں اس کا کیا قصور ہے وہ اپنے مالک کے یہاں سے آ رہی تھی جو اسے

ابھی آنے نہیں دیتا تھا اور یہ بات تو ہر شخص کو معلوم تھی کہ اجیا کے دو حقدار تھے ایک اس کا خاوند، دوسرا اس کا مالک، خاوند سے تو محض اس کا بیاہ ہوا تھا اور مالک اسے خرچ دیتا تھا۔ اس کے لیے ساڑھیاں، جمپر، اونچی ایڑی والے بوٹ، چاندی کی پائل، ریشمی انگلیا، چولی اور گگریاں لا کر دیتا تھا خاوند ایک غریب دکاندار تھا جو آٹا، لون، تیل بیچتا تھا اور افیم کھاتا تھا۔ اور مالک ساڑھے چار سو روپیہ تنخواہ پاتا تھا اور مالکوں کا حق ہمیشہ خاوندوں پر فائق ہوتا ہے انسانی سماج کا یہ ایک سیدھا سا اصول ہے جب اجیا کو چھڑی سے پیٹا گیا تو اس کے مالک کو پتہ چل گیا۔ اور فرقہ وارانہ سوال پیدا ہو گیا کیونکہ وطن عزیز میں صرف ہندو اور مسلمانوں ہی کے فرقے نہیں، بلکہ اور بھی بہت سے فرقے ہیں، جن میں اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے مثلاً پنجابی، پوربی، بنگالی، بہاری، براری، وغیرہ اکثر اوقات ان لڑائیوں میں آدمی قتل نہیں کیے جاتے۔ لیکن جذبات کا خون بے دریغ بہایا جاتا ہے اور بغض و عناد کی آگ پشتہا پشت تک سلگتی رہتی ہے۔ جھگڑا شروع ہوتے ہی ایک چھوٹا سا لڑکا ہانپتا ہوا آیا اور کہنے لگا ''بھاپا جی، بھاپا جی، چماروں سے لڑائی ہونے والی ہے آپ بھی وہاں پہنچے'' میرے رشتہ دار نے ایک مضبوط سی لاٹھی اٹھائی اور بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے، اجیا کے خاوند کی دکان پر بہت سے پنجابی اور پوربئے کھڑے تھے۔ پنجابیوں نے دکان پر ہلہ بول دیا اور چمار کو گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ چماریاں دو ہتڑ چھاتی پیٹنے لگیں خیر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا غریب چماروں نے معاف مانگ لی میں نے چند نوجوان پنجابی کلرکوں سے پوچھا ''بھئی جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے؟'' انہوں نے کہا ''جی اس چمار نے ان پنجابی بابو کو

گالی دی یہ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہیں اور ساڑھے چار سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں ۔اب دیکھئے زمانہ کو کیا ہو گیا ہے یہ چمار لوگ بھی ہمارے منہ آنے لگے ہم مار مار کر ان کا بھیجا نکال دیں گے اگر قرول باغ میں اس طرح چماروں سے دب کر رہے تو گزر ہو چکی'' میں نے کہا'' جانے دیجئے آپ بھی تو زبردستی کرتے ہیں؟'' وہ بولے'' نہیں صاحب یہ Prestege کا سوال ہے وقار کا آپ کیا جانیں قرول باغ کا حال یہ چمار لوگ بڑے کم ذات ہوتے ہیں'' معاملہ یہاں تک بڑھا کہ پولیس کو رپورٹ کی گئی گو چماروں نے معافی مانگ لی تھی لیکن بابو جی کا غصہ ابھی بدستور موجود تھا تھانے میں دونوں فریق کئی دن جاتے رہے اجیا بھی بلائی گئی آخر راضی نامہ ہوا محلے کے پوربئے حکیم صاحب نے جب یہ ماجرا سنا تو انہیں بہت تاؤ آیا۔ جھلا کر کہنے لگے'' ان لفنگے پنجابڑوں نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔تبھی تو سوراج حاصل نہیں ہوتا'' ادھر پنجابڑے پوربیوں کو کوس رہے تھے'' انہوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے ہم ان کی بوٹی بوٹی نوچ لیں گے'' میں نے اپنے رشتہ دار کو سمجھانے کی کوشش کی'' اس میں پنجابی پوربئے کا جھگڑا کیوں پیدا کرتے ہو یہ جھگڑا تو ایک عورت کے متعلق تھا اور جب تک عورتیں دنیا میں رہیں گی یہ جھگڑے تو ہوتے رہیں گے دو سال گزرے مجھے چکور پالنے کا شوق چرایا میں جنگل سے تین چکور پکڑوائے دو نر تھے ایک مادہ اب مجھے چکوروں کو لڑائی سکھانے کا خیال آیا میں ان دونوں چکوروں کو ان کے پنجروں سے نکال کر ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے لڑنے کے لیے چھوڑا لیکن وہ ہزار کوشش کے باوجود لڑنے پر آمادہ نہ ہوئے اور ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ لگائے بھائیوں کی طرح کھڑے

رہے۔ اب میں بہتیرا ان کو آمنے سامنے کر کے ان کی چونچیں لڑواتا ہوں۔ لیکن چکور ہیں کہ گڑ، دانہ اور عدم تشدد کے حامی بنے صم بکم کھڑے ہیں۔ معاً میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے مادہ چکور کو پنجرے سے نکال کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب جو چکوروں نے چونچیں سیدھی کی ہیں تو اتنا لڑے کہ دونوں لہولہان ہو گئے، چکورنی چپکے سے ایک طرف کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔"

ثابت ہوا کہ عورت فساد کی جڑ ہے

میرے رشتہ دار نے کہا "تم پاگل ہو" ان کی بیوی نے مجھ سے چمک کر کہا "یاد رکھو آج تمہیں کھانا نہیں ملے گا"

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، ساون کی پھوار چماریوں نے جگہ جگہ تھم گاڑ کر جھولے لگائے تھے اور ساونی گا رہی تھیں چماروں نے اجلے کپڑے پہنے تھے اور آنکھوں کا جل لگائے ہوئے بازاروں میں ٹہل رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے کچی پکی امبیوں اور جامنوں کا مزہ چکھ رہے تھے۔ دھنیا چماری کی دونوں خورد سال بہوئیں اپنی ساس سے تقاضا کر رہی تھیں کہ وہ انہیں پیسے کے جامن اور دھیلے کے آم خرید کر دے۔ جامن اور آم لے کر وہ خوشی خوشی اپنے ننھے خاوندوں کی انگلیاں پکڑ کر جھولا جھولنے چل دیں اور دھنیا چماری تھی کہ انہیں دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر ہماری بھی اسی طرح بچپن میں شادی ہوئی ہوتی کہ کیا اچھا ہوتا۔ اسی آم کی گٹھلی چوستے چوستے اور بیوی کو انگلی سے لگائے بھاگتے پھرتے اور درختوں سے جامنیں اچک اچک کر کھاتے، "چھوٹا سا بالم مورا انگنا میں گلی کھیلے" پورب میں ساون کی بہار دیکھ کر آج معلوم ہوا کہ بچپن کی شادی کتنی اچھی تھی کتنی پر مسرت زندگی

اور ایک طرف فرنگی ہیں جو ساٹھ سال کی عمر میں بوڑھے کھوسٹ ہو کر بیاہ رچاتے ہیں دراصل یہ موسم کا فتور ہے ان کے ہاں نہ ساون کی پھوار ہوتی ہے نہ آم اور جامن۔ ہر وقت ایک میلا سا کہرا آسمان پر چھایا رہتا ہے یہی سوچ رہا تھا کہ رشتہ دار نے کہا" آج موسم کتنا خوشگوار ہے آؤ آج قطب چلیں آم اور جامن ساتھ لیتے چلیں گے میں نے کہا" اور گھر والی؟ کہنے لگے" آہستہ بولو"

قطب صاحب کی لاٹھ پر بڑی رونق تھی۔ قطب سے پہلے حوض خاص آتا ہے۔ یہ پرانے کھنڈر ہیں۔ حوض خاص میں پرانے مقبرے ہیں یوں تو ساری دلی قبروں سے پٹی پڑی ہے۔ جتنی دنیا دلی کے نیچے آباد ہے اتنی اوپر نہیں حوض خاص کسی زمانے میں ایک بہت بڑا تالاب ہوا کرتا تھا اب ایک جوہڑ سا بنا ہوا ہے ٹوٹی ہوئی شکستہ عمارت میں جا بجا لوگ باگ کونوں میں دبکے بیٹھے تھے کئی لوگ کھانے کا سامان لائے تھے اور پاندان اور بیویاں اور داشتائیں کہیں سارنگی سنائی دیتی تھی کہیں قہقہے ایک ہنگامہ بپا تھا، حوض کا بہت سا حصہ سوکھا پڑا تھا اور اس کی ریت پر چند لوگ فٹ بال کھیل رہے تھے پراسرار اور پیچدار سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے ہم اوپر گنبد کی چھتوں پر جانے لگے چھتوں سے کہیں کہیں پانی ٹپک رہا تھا۔ ایک جگہ دو عورتیں چلی آ رہی تھیں ہمیں دیکھ کر ایک طرف بھی نہ ہو سکیں کیونکہ جگہ بہت تنگ تھی یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا پڑتا یا انہیں بہت سوچا کہ کیا کیا جائے آخر وہ بکریوں والی کہانی یاد آئی چنانچہ ہم دونوں فرش پر لیٹ گئے اور وہ ہمارے اوپر سے گزر کر چلی گئیں آگے چلے تو ایک تنگ زینے کے کونے پر دو نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دی، دونو جوان لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دو لڑکے ان کا راستہ روکے کھڑے

تھے۔ کیسا دلفریب رومان ہے۔ ہم نے سوچا یہاں بھی وہی بکریوں والا قصہ دہرایا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ وہ مڑ کر اوپر چلی گئیں اور وہ نوجوان ان کے پیچھے ہو لیے اور ہم ان کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ گنبد کی چھت پر چڑھ کر ہم نیچے حوض کے سوکھے ریت میں فٹ بال کھیلنے والوں کا تماشا دیکھنے لگے اور وہ لڑکے اور لڑکیاں کسی دوسرے گنبد کے پیچدار زینے کو تلاش کرنے لگے۔

قطب صاحب کی لاٹ بھی ایک دلچسپ جگہ ہے اسے قطب الدین ایبک نے بنایا تھا مرحوم بادشاہ کا ارادہ تھا کہ یہاں چار میناروالی ایک عظیم الشان مسجد بنائی جائے۔ آج کل لوگ اس جگہ کو ''پک نک'' کے لیے استعمال کرتے ہیں ہمارے ہاں مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چلنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن قطب کی سیڑھیوں پر ایسے مناظر ہر روز دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ آدھی رات تک قطب کے باہر ادھر ادھر باغ میں گھومتے رہتے ہیں اور اپنی۔۔۔۔۔ آشناؤں کو ساتھ لے کر پرانے معماروں کی حیرت انگیز صناعی کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ کتنی بلند لاٹ ہے کتنی خوبصورت بناوٹ، کیسے پیارے کتبے، یہی دیکھتے دیکھتے صبح ہو جاتی ہے۔ دراصل دلی والوں کو اپنے بزرگوں سے والہانہ عشق ہے۔ وہی عشق جو لاہور والوں کو اپنی گندی گلیوں سے ہے۔ جب شام ہوتی ہے تو لاہور کی گندی گلیاں اور بازار سج دھج کر جگمگ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن دلی۔۔۔۔ کناٹ پیلس کی دکانیں ساڑھے آٹھ بجے بند ہو جاتی ہیں چاندنی چوک میں نو بجے کے بعد پہرے دار اور کتے بھونکنے لگتے ہیں سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں اور سارے شہر میں ہو کا عالم ہو جاتا ہے۔ اس وقت کئی بار سڑک پر چلتے چلتے

میں نے سوچا۔۔۔۔۔ کہ لوگ جاتے کہاں ہیں۔ سینما تھیٹر، ویران دیکھے ہیں۔ اچھاناچ گھر، رسٹوران، کافے، ڈھونڈنے سے نہیں ملتا یا خدا ان لوگوں کو اپنے گھر کی پرانی اینٹوں سے اس قدر عشق کیوں ہے؟

اب معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ جب دلی کی گلیاں اور بازار ویران ہونے لگتے ہیں تو دلی کے مقبرے آباد ہونا شروع ہوتے ہیں دلی کے مقبروں میں رات کو وہی رونق ہوتی ہے جو لاہور کے انارکلی بازار میں، یا کلکتہ کے نیو مارکیٹ میں، رات کو آپ کہیں جائیے، آپ کو دلی کے بازار، گلیاں، سڑکیں سنسان اور اداس نظر آئیں گی لیکن قطب صاحب کی لاٹ پر چہل پہل ہوگی۔ حوض خاص میں قہقہوں کی آواز سنائی دے گی۔ فیروز شاہ کوٹلے کے کھنڈروں میں سہانی محفلیں گرم ہیں۔ ہمایوں کے مقبرے میں لوگ دادِ عشرت دے رہے ہیں۔ اس کونے میں۔۔۔ کالج کی لڑکیاں، ادھر نواب جمن شاہ جو خاندان تیموری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مس عذرا جان کا گانا سن رہے ہیں۔ قرول باغ کا ایک چمار جو دوسرے چمار کی بیوی اڑا لایا ہے۔ چند آوارہ مزاج نوجوان گرسنہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہمایوں کا مقبرہ خاموش محوِ حیرت ہے کئی لوگ پاندان، اگالدان، غالیچے، ریشمی بستر، حقے، گیس، لیمپ تک ساتھ لائے ہیں۔ ایک کونے میں۔۔۔ کالج کی لڑکی اپنے ساتھی سے کہہ رہی ہے ''شیٹ اپ یو سوائن'' لڑکے نے مسکرا کر اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چومنا شروع کر دیا۔ انہی سیڑھیوں پر ہمایوں گرا تھا۔ انہی راہوں پر اس نے اپنی کھوئی بادشاہت حاصل کی تھی شیٹ اپ یو سوائن نواب جمن شاہ اپنی محبوبہ سے کہہ رہے تھے مجھے سینما اور تھیٹر مطلق پسند

نہیں ۔ہم لوگ اس قسم کی لغویات پسند نہیں کرتے جی بجا فرمایا۔۔۔۔ ہندوستان کے لوگ عالمگیر روحانیت کے مالک ہیں۔وہ مذہب پر جان دیتے اور جان لیتے ہیں ۔وہ نسبتاً شریف ہیں وہ سینما،تھیٹر،ناچ گھر اور اس قسم کی لغویات نہیں کرتے وہ صرف اپنے بزرگوں کی پرستش کرنا جانتے ہیں اور ساری ساری رات ان عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے ریاضت کرتے رہتے ہیں قطب الدین ایبک کا ارادہ تھا کہ وہ اس قسم کے چار مینا اور بنائے ،چار اور عیش گاہیں یہ اشوک کے قطبے پر کیا لکھا ہے ''زندگی میں راستی سے کام لو'' شٹ اپ یو سوائن!

بہت رات گزر رہے چاندنی چوک میں جلسہ ہو رہا تھا مقرر چلا چلا کر کہہ رہا تھا

''ہم ایک ہیں، ہندو مسلمان سب بھائی بھائی ہیں ہم میں کوئی نسلی امتیاز نہیں ہے پنجاب سے لے کر راس کماری تک ہم ایک ملک کے باشندے ہیں ایک قوم، ایک زبان، ہم ہندوستانی ہیں۔۔۔ میں سوچا ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ایک طوائف ہے اور ہم لوگ اس کے دلال، ہم میں سے ہر ایک نے اسے کسی نہ کسی کے ہاتھوں بیچا ہے۔آریوں کے ہاتھوں، یونانیوں کے ہاتھوں،عربوں کے ہاتھوں، ترکوں کے ہاتھوں، فرنگیوں کے ہاتھوں ۔۔۔۔۔او راب آدھے ہندوستانی اسے مغربیوں کے ہاتھوں بیچنا چاہتے ہیں اور آدھے جاپانیوں کے ہاتھوں۔۔۔۔۔جھوٹے ،مکار،فریبی''

اس لیے بہتر یہی ہے کہ بجاؤ ڈھول تاشے اور نفیری اور چلو ہمایوں کے مقبرے

☆☆☆☆

پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں، اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آ گئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے سفید ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا۔ اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے پکھراج کے نگینوں کی طرح جھلملائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا۔ اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی باآ آ آ سے جھنجھنا اٹھے گی اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا ابھی تنگوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں ابھی پہاڑوں پر برف کا کہر تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آوا سے گونجا نہ تھا۔ ابھی سمل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا۔ جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شگوفے چمکنے لگے تھے اپریل میں زمستان کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں

اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے ننھے شکار سطح آپ پر رقصاں ولرزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پل کے جنگل کا سہارا لے کر میں ایک عرصہ سے انتظار کر رہا تھا سہ پہر ختم ہوگئی شام آ گئی، جھیل ولر کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی سنگلاخ محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے۔ اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کی قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا۔ اور قرمزی سے سرمئی اور سرمئی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سوگئی اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارا کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی۔ اور نتھنے اس کے بر فیلے مس سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا

اور پھر وہ آ گئی

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، بلکہ پگڈنڈی کی ڈھلان پر دوڑتی ہوئی وہ میرے قریب آ کے رک گئی اس نے آہستہ سے کہا

''ہائے!''

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، پھر رک جاتی، پھر تیزی سے چلنے لگتی۔ اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

''سہہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں''

اس نے ہنس کر کہا'' اب رات ہو گئی، بڑی اچھی رات ہے یہ'' اس نے اپنا کمزور ننھا چھوٹا سا ہات میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور جیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو گئی۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی بولی'' ابا میرے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے، کیونکہ میں نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے آج مجھے اپنی سہیلی رجو کے گھر سونا ہے، سونا نہیں ہے جاگنا ہے، کیوں کہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور یہی تو سہہ پہر سے تیاری کر رہی تھی، ادھر آنے کی لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں سے یہ جوڑا کل دھویا تھا آج سوکھا نہ تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل میں لکڑیاں چننے گئی تھیں۔ وہ ابھی آئی نہ تھیں اور جب تک وہ نہ آتیں میں مکئی کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور جر والو تمہارے لیے کیسے لا سکتی ہوں دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمہارے لیے ہائے تم تو سچ مچ خفا کھڑے ہو میری طرف دیکھو میں آ گئی ہوں آج پورے چاند کی رات ہے۔۔۔۔۔ آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور یہ چاند مجھ سے کہہ رہا تھا، جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو آج بادام کے پہلے شگوفوں کا مسرت بھرا تیوہار ہے۔ آج اس نے تمہارے لیے اپنی سہیلیوں، اپنے ابا، اپنی ننھی بہن، اپنے

بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے، کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خنک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچے کے دودھ کی طرح امنڈ آئے ہیں۔اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سرخ ست لڑی اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا ''تو آج رات بھر جاگے گی آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے، جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں یہ سرخ ست لڑیاں پہن لے۔''

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کر دیکھا پھر یکایک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے اور تنگوں سے پرے بستی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی۔ گیت اور بچوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننھے بچوں کے رونے کی میٹھی صدائیں چھتوں سے اور زندگی کا آہستہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں، اور شام کے کھانے کی مہک، مچھلی اور بھارت اور کڑم ساگ کا نرم نمکین اور لطیفہ ذائقہ اور پورے چاند کی رات کا بہار آفرین جوبن میرا غصہ ڈھل گیا میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کہا ''آؤ چلیں جھیل پر۔''

پل گزر گیا پگڈنڈی گزر گئی، بادام کے درختوں کی قطار ختم ہوگئی تلہ گزر گیا اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے مینڈک اور جھینگر اور بینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ایک خواب ناک سمفنی اور سوئی ہوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی،

ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، ہزاروں سال سے اسی طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر، تمہاری اور تمہارے محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات کسی کنواری کے بے چھوئے ملائم جسم کی طرح محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی جو بالکل جھیل کے کنارے اگا تھا یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آ رہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گا رہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی میں نے دونوں ہات اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے زور زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چوم رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ پھر میں نے اس کے رخسار چومے اور نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدہا گیت گانے لگے۔ پھر میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں پر اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے پھر میں نے اس کی ٹھوڑی کو چوما اور پھر اس کی گردن کے پیچ وخم کو اور کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے، کلیوں کی طرح اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی، وہی جھیل کے نرم نرم بوسے اور کوئی چھاتی سے لگا سسکیاں لے رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی کشتی میں بیٹھ گئی میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے

لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہوگئی نہ ادھر بہتی تھی اور ادھر میں نے چپو اٹھا کر کشتی میں رکھ لیا اس نے پوٹلی کھولی اس میں سے جر والو نکال کر مجھے دیئے خود بھی کھانے لگی۔

جر والو خشک تھے اور کھٹے میٹھے

وہ بولی پچھلی بہار کے ہیں

میں جر والو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا

وہ آہستہ سے بولی

''پچھلی بہار میں تم نہ تھے''

پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور جر والو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور جر والو کے پیڑ پھلوں سے لدے پھندے تھے، سبز سبز جر والو، سخت کھٹے جر والو جو نمک مرچ لگا کے کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی اور پھر بھی کھٹے جر والو کھائے جاتے تھے پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور یہ سبز سبز جر والو، پک کر پیلے اور سنہرے اور سرخ ہوتے گئے اور ڈال ڈال میں مسرت کے سرخ شگوفے جھوم رہے تھے اور مسرت بھری آنکھیں، چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں انہیں جھومتا ہوا دیکھ کر رقص سا کرنے لگتیں۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور سرخ سرخ جر والو خوبصورت ہاتھوں نے اکٹھے کر لیے خوبصورت لبوں نے ان کا تازہ رس چوسا اور انہیں اپنے گھر کی چھت پر لے جا کر سوکھنے کے لیے رکھ دیا کہ جب یہ جر والو سوکھ جائیں گے، جب بہار گزر جائے گی اور دوسری بہار

آنے کو ہو گی تو میں آؤں گا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہو سکوں گا۔

جروالو کھا کے ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں، خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب وہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہد و شکر کا مزہ دینے لگتی

''نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ'' میں نے کہا

اس نے گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا ''کھاؤ''

بیج بادام کی طرح میٹھا تھا

''ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں''

اس نے کہا ''یہ ہمارے آنگن کا پیڑ ہے ہمارے ہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے مگر اتنی سرخ اور میٹھی خوبانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری ساری سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں ۔۔۔۔۔۔پچھلی بہار میں ۔۔۔۔''

اور میں نے سوچا، پچھلی بہار میں، میں نہ تھا مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا، پچھلی بہار میں جو نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نوکیلے پھل لگے تھے ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے تھے پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور ان خوبانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہو گئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ملکا سنہرا ہونے لگا تھا اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے پچھلی بہار میں، میں نہ تھا۔ اور یہ سرخ سرخ خوبانیاں جو اپنی رنگت میں کشمیری دوشیزاؤں کی طرح صبیح تھیں اور ایسی ہی رس دار سبز سبز پتوں کے

جھومروں سے جھانکتی نظر آتی تھیں پھر الھڑ لڑکیاں آنگن میں ناچنے لگیں اور چھوٹا بھائی درخت کے اوپر چڑھ گیا اور خوبانیاں توڑ توڑ کر اپنی بہن کی سہیلیوں کے لیے پھینکتا گیا۔ کتنی میٹھی تھی، وہ پچھلی بہار کی رس بھری خوبانیاں، جب میں نہ تھا۔۔۔۔

خوبانیاں کھا کے اس نے مکئی کا بھٹا نکالا ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی سنہرا سینکا ہوا بھٹا اور کرکرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی جلا لیے ہوئے اور ذائقے میں بے حد شیریں۔

وہ بولی ''یہ مصری مکئی کے بھٹے ہیں''

''بے حد میٹھے'' میں نے بھٹا کھاتے ہوئے کہا

وہ بولی ''پچھلی فصل کی رکھے ہوئے تھے، گھڑوں میں چھپا کے اماں کی آنکھ سے اوجھل''

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا، دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں، پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لیے رہنے دیں جنہیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم ایک ہی بھٹے سے کھاتے گئے اور میں نے سوچا، یہ مصری مکئی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں یہ پچھلی فصل کے بھٹے جب تو تھی لیکن میں نہ تھا جب تیرے باپ نے ہل چلایا تھا کھیتوں میں، گوڑی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اگائے تھے جن میں تو نے نلائی کی تھی پھر پودے بڑے ہو گئے تھے اور ان کے سروں پر سریاں نکل آئی تھیں اور ہوا میں جھومنے لگی تھیں اور تو مکئی کے پودے پر ہرے

ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی جب میں نہ تھا لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھرتی پر اگائے تھے اور میں نہ تھا اور پھر یہ بھٹے جوان و توانا ہو گئے اور ان کا رس بھی پختہ ہو گیا پختہ اور سخت اب ناخن لگانے سے کچھ نہ ہوتا تھا اپنے ناخن ہی کے ٹوٹنے کا احتمال تھا بھٹوں کی مونچھیں جو پہلے پیلی تھیں اب سنہری اور پھر آخر میں سیاہی مائل ہوتی گئیں مکئی کے بھٹوں کا رنگ زمین کی طرح بھورا ہوتا گیا۔ میں جب بھی نہ آیا تھا اور پھر کھیتوں میں کھلیان لگے اور کھلیانوں میں بیل چلے اور بھٹوں سے دانے الگ ہو گئے۔ اور تو نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ محبت کے گیت گائے اور تھوڑے سے بھٹے چھپا کے سینک کے الگ رکھ دیئے جب میں نہ تھا، دھرتی تھی، محبت کے گیت تھے، آگ پر سینکے ہوئے بھٹے تھے، لیکن میں نہ تھا

میں نے مسرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "آج پورے چاند کی رات کو جیسے ہر بات پوری ہو گئی ہے کل رات پوری نہ تھی آج پوری ہے"

اس نے بھٹا میرے منہ سے لگا دیا اس کے ہونٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بھٹے پر تھا میں نے کہا "میں تمہیں چوم لوں"

وہ بولی: ہش، کشتی ڈوب جائے گی

"تو پھر کیا کریں؟" میں نے پوچھا

وہ بولی: "ڈوب جانے دو"

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی میری عمر ستر برس کے قریب

ہے لیکن وہ پورے چاند کی رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی ہے جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی اس نے بھی نہیں کی ہوگی وہ جادو ہی کچھ اور تھا جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی اسی رات میرے ساتھ بھاگ آئی اور ہم پانچ چھ دن محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا مافیہا سے بے خبر پھر میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے کوئی ایک مہینہ کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک رکابی میں کھانا کھا رہے تھے ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھ لیا لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا وہ اپنی مسرت میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور میں نے سوچا کہ یہ پچھلی بہار یا اس سے بھی پچھلی بہار کا محبوب ہے، جب میں نہ تھا اور شاید اور آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی، کتنی پورے چاند کی راتیں، جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں ہو گئی ہے جیسے ہر بہار کے بعد آتی ہے اب تیرا یہاں کیا کام اس لیے میں یہ سوچ کر ان سے ملے بغیر ہی واپس چلا گیا اور اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں میرے بیٹے میرے

ساتھ ہیں میری بیوی مر چکی ہے لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم لوگ سیر کرتے کرتے سمل جھیل کی طرف آ نکلے ہیں اور اپریل کا مہینہ ہے، سہ پہر سے شام ہوگئی ہے اور میں دیر تک پل کے کنارے کھڑا بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خنک ہوا میں سفید شگوفوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے دور پار تنگوں سے پرے بستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے وہ اسے کھانے پر بلا رہی ہے کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایکدم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں اور پھر ایکدم چپ ہو جاتے ہیں ضرور کوئی مانجی گا رہا ہے اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اس پار گم ہوتی جارہی ہے۔

میں پل پار کر کے آگے بڑھتا ہوں، میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہوگئی، تلہ بھی ختم ہوگیا جھیل کا کنارا ہے، یہ خوبانی کا درخت ہے لیکن کتنا بڑا ہوگیا ہے مگر کشتی، یہ کشتی ہے مگر کیا یہ وہی کشتی ہے سامنے وہ گھر ہے، میری پہلی بہار کا گھر، میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے، بچوں کی صدائیں ہیں، کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا

ہے کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کر دیتی ہے میں سوچتا ہوں، آدھی صدی ہوگئی ہے میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے آخر میں نے اسے خریدا تھا دیکھا جائے تو میں ابھی تک اس کا مالک ہوں دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لیے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے مجھے دیکھ کے ٹھٹک جاتی ہے دو بچے لڑ رہے ہیں مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں بڑھیا جو ابھی غصہ میں ڈانٹ رہی تھی، کھم کے پاس آ کے کھڑی ہو جاتی ہے، کہتی ہے کون ہو تم؟

میں نے کہا: ''یہ میرا گھر ہے''

وہ بولی: ''تمہارے باپ کا ہے''

میں نے کہا: ''میرے باپ کا نہیں ہے، میرا ہے کوئی اڑتالیس برس ہوئے میں نے اسے خریدا تھا بس اس وقت تو یونہی اسے دیکھنے چلا آیا آپ لوگوں کو نکالنے کے لیے نہیں آیا ہوں یہ گھر تو سمجھیے اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یونہی۔۔۔میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا بڑھیا کی انگلیاں سختی سے کھم پر جم گئیں اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی، بولی تو تم ہو۔۔۔۔اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے۔۔۔۔''

وہ کھم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی میں نیچے آنگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی، بولی ''آؤ میں تمہیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں۔۔۔۔دیکھو، یہ میرا بڑا بیٹا ہے یہ اس سے چھوٹا ہے، یہ

بڑے بیٹے کی بیوی ہے، یہ میرا بڑا پوتا ہے، سلام کرو بیٹا۔ یہ پوتی ۔۔۔۔۔ یہ میرا خاوند ہے۔۔۔۔۔ ششش، اسے جگانا نہیں، برسوں سے اسے بخار آ رہا ہے سونے دو اسے۔۔۔"

وہ بولی: "تمہاری کیا خاطر کروں"

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکئی کے بھٹوں کو دیکھا سینکے ہوئے بھٹے سنہرے موتیوں کے سے شفاف دانے

ہم دونوں مسکرا دیئے

وہ بولی: "میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں، جو ہیں وہ بھی کام نہیں کرتے"

میں نے کہا: "یہی حال میرا بھی ہے بھٹا نہ کھا سکوں گا"

مجھے گھر کے اندر گھستے دیکھ کر میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے اب خوب گہما گہمی تھی بچے ایک دوسرے سے بہت جلد مل جل گئے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے

وہ بولی: "میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا تم اس روز کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کہا "میں آیا تھا مگر تمہیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔"

"کیا کہتے ہو؟" وہ بولی

"ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں، ایک ہی رکابی میں اور وہ تمہارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے ڈال رہی تھیں"

وہ اک دم چپ ہوگئی پھر زور زور سے ہنسنے لگی

''کیا ہوا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا

وہ بولی: ''ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا''

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی ''وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اسی روز تم بھی آنے والے تھے وہ واپس جا رہا تھا میں نے اسے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے، تم پھر آئے ہی نہیں''

وہ اک دم سنجیدہ ہوگئی چھ برس میں نے تمہارا انتظار کیا تمہارے جانے کے بعد مجھے خدا نے بیٹا دیا تمہارا بیٹا مگر ایک سال بعد وہ بھی مر گیا چار سال میں اور تمہاری راہ دیکھی، مگر تم نہیں آئے پھر میں نے شادی کر لی۔

اس نے کہا: ''وہ میرا پوتا ہے''

میں نے کہا: ''وہ میری پوتی ہے''

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو خوبصورت مرقعے ہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے وہ میرے قریب آ گئی بولی ''آج تم آئے ہو تو مجھے اچھا لگ رہا ہے میں نے اب زندگی بنا لی ہے اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں میرا ہرا بھرا گھر ہے اور آج تم بھی آئے ہو، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''یہی حال میرا ہے سوچتا تھا زندگی بھر تمہیں نہیں ملوں گا اسی لیے اتنے برس ادھر کبھی نہیں آیا اب آیا ہوں تو ذرا رتی بھر بھی برا نہیں لگ رہا''

ہم دونوں چپ ہو گئے بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے قریب واپس آ گئے اس نے

میری پوتی کو اٹھالیا، میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت سے اور مسرت سے کہہ رہا تھا'' انسان مر جاتے ہیں، لیکن زندگی نہیں مرتی، بہار ختم ہو جاتی ہے، لیکن پھر دوسری بہار آجاتی ہے چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں لیکن زندگی کی بڑی عظیم محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے یہ بہار تم نے دیکھی، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے لیکن زندگی بھی ہو گی اور محبت بھی ہو گی اور خوبصورتی اور رعنائی اور معصومیت بھی۔۔۔۔''

بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ کھیلنا چاہتے تھے وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی

میں نے پوچھا ''یہ وہی درخت ہے''

اس نے مسکرا کر کہا: ''نہیں یہ دوسرا درخت ہے''

☆☆☆☆☆

پہلا اور تیسرا

پہلے درجہ میں لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے، سپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی کے جھٹکوں میں مومی بتوں کی طرح ہل رہے تھے۔ ان بتوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے یا چمکیلے امریکی ناول، کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی وہ بھی ایک آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی۔ یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا یہاں خاموشی تھی اور ایک طویل گہرا سناٹا اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کسی ہزار ہا سال پرانے مندر میں آ نکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو۔۔۔۔۔

تیسرے درجے میں بڑی بھیڑ تھی وہ بڑی مشکل سے اندر آ سکا اور ڈبے کے دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی جگہ اسے ملی جس میں وہ ایک پاؤں فرش پر لٹکا سکا، دوسرا پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ تھی دوسرا پاؤں اس نے ذرا پیچھے سرکایا تو سیاہ چمکیلے بالوں والی سانولی کرسچین حسینہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا مگر رمیش بھی مجبور تھا اب اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے لے کر ران تک اس سانولی لڑکی کی ٹانگ سے چپک گئی تھی، اور اب وہ دونوں ٹانگیں گاڑی کی لے پر ڈبل اسپرنگ کی طرح حرکت کرتی تھیں یہ محض اتفاق تھا، مگر انسانی جسم کو کیا کیا جائے، یہ بھی ایک مشین ہے، جب تک یہ مشین چلتی ہے حرکت کرتی ہے اس سے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں چنانچہ لڑکی کا چہرہ بے حد ملیح ہو گیا اور رمیش کو اس کے بالوں سے خوشبو بھی آنے لگی اور لڑکی کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں

پھوٹ نکلیں، جیسے پھول کی پتیوں پر شبنم بکھر جاتی ہے اور اس کے کان میں وہ آویزہ گاڑی کی لے پر ڈول رہا تھا۔ شاید اب رمیش کا دل بھی اس لے پر ڈول رہا تھا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس عیسائی حسینہ کو اپنی بانہوں میں لپٹا لے اور اس کے چھوٹے سے ادھ کھلے دہن پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ لوکل فاسٹ نہیں تھی اگلے اسٹیشن پر رک گئی اور یہاں پر بہت سے مسافر اتر گئے اور دوسرے مسافروں کے ریلے کے اندر آنے سے پہلے اس عیسائی حسینہ نے اپنے لیے ایک سیٹ تلاش کر لی اور اپنے پھول دار میلے سائے پر کمر سے کولہے تک ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی ماہی گیر عورت کے پاس بیٹھ گئی رمیش نے اور پھر اس عیسائی لڑکی نے ایک لمحے کے لیے محبوب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک نگاہ میں کتنا ملال تھا پھر دوسرے لمحے میں جیسے برقی رو ٹوٹ گئی اور پھر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے لیکن ان دونوں کے درمیان ایک صدی ایسا لمبا لمحہ آیا تھا جب وہ دونوں مکمل اجنبی ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے تھے، جیسے دو چاہنے والے ہی ہو سکتے ہیں اور رمیش سوچنے لگا یہ انسانی جسم بھی کتنی عجیب مشین ہے جب برقی رو کٹ جاتی ہے تو جذبات کام نہیں کرتے اور جب تک برقی رو جاری و ساری ہے ساری کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اور ریلے میں دو سرکاری چپراسی داخل ہوئے اور تین چار سادھو اور ایک بھیک مانگنے والا جو مختلف جانوروں کی بولیاں بول کر پیسے مانگ رہا تھا۔ یہ بھک منگا دونوں آنکھوں سے اندھا تھا، اور اس کا سر گھٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اور وہ کبھی اپنا دایاں ہاتھ منہ پر رکھ کے اور کبھی بایاں ہاتھ اور دایاں

ہاتھ دونوں اپنے منہ کے قریب لے جا کے مختلف آوازیں نکالتا تھا۔

یہ کوا بولتا ہے ”کائیں کائیں“

اندھے نے کبھی کوا دیکھا ہے، جب وہ اپنے سیاہ چمکیلے پروں کو پھیلا کر نیلے آسمان پر پرواز کرتا ہے اور شریر بچوں کی طرح شور مچاتا ہے

یہ پہاڑی کوا۔۔۔۔

پہاڑی کوا؟ تو نے پہاڑ دیکھے ہیں اندھے، اونچے اونچے پہاڑ جن کی سر بفلک چوٹیوں پر سفید برف ہوتی ہے جن کے سینے سے دو آبشار بہتے ہیں اور جنگل کے سبز پیراہنوں میں گلہریاں اور خرگوش، اور چھوٹے چھوٹے بندر اور لنگور اور خوبصورت پروں والے تیتر اپنی زندگی کی خوبصورت تصویر بناتے ہیں پھر کبھی کبھی کسی کھڑک کے تنے سے لگا ہوا کوئی ریچھ چاروں طرف دیکھتا ہے اور ہوا میں اپنی تھوتھنی کو اونچا کر کے شہد کے چھتوں کی خوشبو سونگھتا ہے

یہ ہوائی جہاز کی آواز۔۔۔۔۔۔

تو نے ایلومونیم کا وہ سفید پرندہ نہیں دیکھا جو پروپلر گھماتے ہوئے چار انجنوں کا شور مچاتے ہوئے فضا میں اڑتا ہے اور جس کے پیٹ میں انسان اس طرح بیٹھتے ہیں جس طرح اس گاڑی کے ڈبے میں مسافر بیٹھے ہیں مگر ہوائی جہاز میں ایسی بھیڑ نہیں ہوتی ایسے بھک منگے بھی نہیں ہوتے وہاں آرامدہ کرسیاں ہوتی ہیں اور خوبصورت پردے ہوتے ہیں اور سیم تن نازک بدن حسین عورتیں مسافروں کو رنگا رنگ کاغذوں میں لپٹے ہوئے سوندے سوندے چاکلیٹ کھلاتی ہیں۔

ماہی گیر عورت جو بیڑی پی رہی تھی اس نے اندھے کو ایک آنہ دیا اور بولی ”جا،

اب دفان ہو جا، کسی دوسرے ڈبے میں جا کے یہ بولیاں سنا، بہت مغز چاٹ لی ہے تم نے‘‘

اتنا کہہ کر وہ خوب پھیل کر بیٹھ گئی، عیسائی لڑکی پھر سمٹ گئی، ماہی گیر عورت نے اپنی خالی ٹوکری جس میں مچھلیوں کی باس رچی ہوئی تھی اپنے ہاتھوں سے خوب اچھی طرح تھپتھپائی اسے جھاڑ پونچھ کے سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور خوب زور زور سے بیڑی پینے لگی اور کرسچین لڑکی سے کہنے لگی مچھلی تو بڑے شوق سے کھاتی ہے اور اب یہاں ناک پر رومال رکھتی ہے، تیری یہ بٹن ایسی ناک سڑ تو نہیں جائے گی، بھلا۔

کرسچین حسینہ نے ناک سے رومال ہٹالیا آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے، ماہی گیر عورت اور زور زور سے بیڑی پینے لگی۔ ہنسنے اور بیڑی پینے کے درمیان اسے کھانسی آ گئی اب وہ ہنس رہی تھی اور بیڑی کا دھواں اس کے نتھنوں سے نکل رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے قریب کی جھریاں اور گہری ہو گئی تھیں اور کانوں میں سونے کا بوجھل دبگڑا کسی طلائی مچھلی کی طرح لٹک رہا تھا جیسے مچھلی کانٹے میں پھنس کر بار بار تڑپ رہی ہو۔

ایک سادھو دوسرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کل نرگس کی نئی تصویر دیکھی ری بولی سینما میں واہ وا مجا آ گیا رام جانے لڑکی کیا ہے امرت کا گھونٹ ہے تو نے ری بولی کی تصویر دیکھی ہے۔

نہیں گورو! اپن کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے، پرسوں میرے گورو کو سیٹھ پھر سڑمل کے ہاں دکشنا ملی تھی ساڑھے آٹھ آنے گورو نے مجھے بھی دیئے، میں تو

سرکس دیکھ آیا مگر رام جانے سرکس کی چھوکریوں میں وہ دم نہیں ہے اب کے گورو نے آنکھ کھولی وہ سیٹ پر ہی بھنگ اور چرس کے مراقبے میں چلے گئے تھے اب کے انہوں نے ایسے چیلوں سے جو یہ گفتگو سنی تو انہوں نے ایک آنکھ کھولی اور شکایت رکنےوالے سے چیلے کہا اس نے کہا دس آنے دوں گا، رام پان میں سو بھنا سامرتھ کو دیکھ آئیو۔ بالکل سیتا ماتا معلوم ہوتی ہے گنگا مائی کی طرح شیتل اور نرمل

چھوٹا چیلا ٹھنکنے لگا نہیں گورو ہم تو نرگس کی نئی تصویر دیکھیں گے سنا ہے اس میں ایک ڈانس بہت اچھا ہے

گورو بولے: ''اے جا وہ ڈانس کیا ہو گا یاد ہے اپنے گاؤں کی وہ مہتاری چمارن گنگا میا کی سوگند لے لو اس سے اچھا کون ناچے گا، کیوں بے بھورے یاد ہے وہ برسات کا میلہ''

بڑا چیلا ہونٹ تر کرکے بولا مہتاری کا جواب نہیں ہے گورو میں سمجھتا ہوں اب کے تم سردیوں میں دیس جاؤ تو اسے ساتھ ہی لیتے آؤ۔ بے کار میں یہاں سے ہر مہینے منی آرڈر بھیجتے ہو یہیں ایک فلم کمپنی کھول دیں گے، کیوں بے چچا

چچا بڑے گورو کا پاؤں دابنے لگا، ہاں گورو ہو جاؤ پھر

بڑے گورو مسکرائے انہوں نے لنگوٹ کی تہہ میں ہات ڈال کے ایک چونی اور تین دونیاں نکالیں اور انہیں چھوٹے چیلے کی ہتھیلی پر رکھ کر کہا جا تو بچہ ہے ابھی نرگس کی فلم دیکھ آ میں تو موہ مایا سب تیاگ چکا خالی رام کا نام لیتا ہوں بڑے گورو نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور گانجے کے مراقبے میں چلے گئے

چند کلرک آمنے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھے بڑے زور کی بحث کر رہے تھے۔

ریلوے ہڑتال نہیں ہوئی، اچھا ہوا، کمیونسٹ بہت شور مچاتے تھے، سالوں کی بدھیا بیٹھ گئی بہت اچھا ہوا۔

کیسے اچھا ہو، ایک پارسی کلرک نے ناک میں گنگاتے ہوئے کہا

ارے ملک میں بڑا خطرہ تھا بفروان جی بھائی، تم کیا جانو، گجرات میں کال پڑا تھا اگر ہڑتال ہو جاتی تو لوگ بھوکے مر جاتے۔

اب کیا گجرات میں کال ختم ہو گیا ہے، مہنگائی ختم ہو گئی ہے، بھوک ختم ہو گئی ہے؟ تیسرا کلرک بولا

دوسرا کلرک بولا ''ہاں اس کا جواب دو''

پہلا کلرک بولا آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا ابھی تو اپنی حکومت آئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔

دوسرا بولا دو سال ہی میں کیا کم ہوا ہے مہنگائی کہاں سے کہاں چلی گئی سچ جانو میں نے چھ مہینے سے جراب تک نہیں پہنی بڑا لڑکا میں اسکول سے اٹھالیا

وہ کیوں!

فیس دوگنی ہوگئی، کتابوں پر محصول لگا دیا، بچے کو کہاں سے پڑھاؤں میں نے اسے راشننگ کے محکمے میں چپڑاسی کی ملازمت دلا دی ہے دیکھ لینا ایک روز ترقی کرتا کرتا وزیر اعظم بن جائے گا۔

سب کلرک ہنسنے لگے پہلا کلرک کہنے لگا مگر مجھے تو کمیونسٹوں کی ہار پر خوشی ہے، ہڑتال سے پہلے کتنا اچھلتے تھے

تمہارے سوشلسٹوں نے عین وقت پر دھوکا دیا پارسی بولا

مگر کوئی تو آتا، کہیں پر کچھ تو ہوتا سب بھیگی بلی بن کر بیٹھ گئے ایک مزدور بھی نہیں اٹھا، اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، یہ گنوار مزدور اور اجڈ کسان ہیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو جتنا دبا کے رکھا جائے اتنا ہی یہ ٹھیک رہتے ہیں ذرا ڈھیل دے دو تو سر چڑھ جاتے ہیں، سرکار نے ٹھیک کیا۔

ایک اور آدمی بولا نو مارچ کو دیکھا نہیں تھا، چپے چپے پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا ریل کی پٹڑی پر، اسٹیشنوں پر، کارخانوں پر، لوکو ورکشاپ میں، سنا ہے کوئی ہل نہیں سکتا تھا حکم تھا کوئی ذرا چین چپٹ کرے تو اسے گولی سے اڑا دو۔

ایک آدمی جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور جس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور جس کے گھٹنوں پر تیل کے بڑے بڑے داغ تھے اور میل کی تہیں، اور جو بڑی بے چینی اور پریشانی سے یہ گفتگو سن رہا تھا یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اس کلرک کو جو گولی سے اڑا دینے کا ذکر بڑی شیخی سے کر رہا تھا، زور سے ایک طمانچہ مارا، طمانچہ اس زور کا تھا کہ کلرک کا منہ دوسری طرف گھوم گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اتنے میں دوسرے لوگوں نے مزدور کو پکڑ لیا

مزدور نے زور سے اپنی باہیں چھڑا لیں اور کہا اب دیکھنا سالو

یہ لوگ اس پر پل پڑے ایک کونے میں چار مارواڑی تاش کھیل رہے تھے انہوں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پکڑو، پکڑو، اسے یہ کمیونسٹ ہے مارو، مارو اسے جان سے مار دو پولیس کے حوالے کر دو۔

مزدور لڑ رہا تھا لیکن وہ اکیلا تھا اور وہ بہت سارے تھے، پھر بھی وہ دو چار آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس نے مدد کے لیے ادھر ادھر دیکھا دور ایک کونے

میں سے ایک آدمی اٹھا، اس نے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اس نے کلرک کو پیٹنا شروع کر دیا پھر ماہی گیر عورت بیڑی کا دھواں نکالتی ہوئی اٹھی اور اس نے مچھلی والی ٹوکری لوگوں کے سر پر دے ماری اور چیخنے چلانے اور گھونسے مارنے لگی ایک گھونسا غلطی سے رمیش کو بھی لگا اور اسے معلوم ہوا کہ مچھلی بیچنے والی عورت کا گھونسا کتنا تگڑا ہوا ہے، اور پھر ایک عورت آ گئی اس نے بھی بڑے اچھے اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے، اور وہ بھی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے مزدور کی حمایت میں لڑنے لگی۔ ایک سادھو کا کرمنڈل ایک مارواڑی کے سر پر اوندھا ہو گیا اور اس میں دال، چینی، چاول، سنگترے کی قاشیں، چنبیلی کے پھول، بینگن کی بھاجی اور پسی ہوئی سرخ مرچیں چاروں طرف پھیل گئیں اور لوگ کھانسنے لگے اور مارواڑی چلانے لگا اور کسی نے ان کی تاش اٹھا کر باہر پھینک دی کسی نے پگڑی اچھال دیا، اور دو مارواڑی رونے لگے اور چلانے لگے، کمیونسٹ آ گئے، زنجیر کھینچو، ہڑتالی آ گئے، ہڑتالی آ گئے۔

یکا یک گاڑی کھڑی ہو گئی اور پھر پولیس آ گئی

جب مجمع ذرا چھٹا تو معلوم ہوا کہ میلے میلے کپڑوں والا مزدور غائب ہے، اور ماہی گیر عورت کا ٹوکرا ٹوٹ گیا ہے اور نوجوان عورت کا رنگین لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے والے نوجوان کا منہ نوچا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ سے خون نکل رہا ہے۔ لیکن ماہی گیر عورت کا زیادہ نقصان ہوا۔ ہاں وہ ان لوگوں کی گت دیکھ کر ہنس رہی تھی، جنہوں نے مزدور کو پکڑنا چاہا تھا، پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ مارواڑی ہاتھ بڑھا بڑھا کر گرجنے لگے، یہی تھی جو اس کے لیے لڑ

رہی تھی اور یہ آدمی، یہ عورت، یہ جوان، یہ بابو اور وہ کم بخت ہڑتال کرانے والا کمیونسٹ تھا اس کو انہوں نے بھگا دیا۔

ماہی گیر عورت نے چلانے والے مارواڑی کی طرف اپنی ٹوکری زور سے پھینکی جو ٹھیک اس مارواڑی کے گلے میں آویزاں ہوگئی، سب لوگ ہنسنے لگے ماہی گیر عورت بولی تو لڑائی میں حصہ کیا لے گا، تو نہ مرد ہے، نہ عورت، تو دلال ہے دلال دونوں طرف سے کمیشن کھاتا ہے، تیرے جیسا مارواڑی ہمارے دارسوا میں بھی تھا، وہ ہمارے مچھلیوں کو اپنے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتا تھا اور سارا پیسہ خود ہڑپ کر جاتا تھا اب ہم سارے گاؤں کے ماہی گیروں نے مل کر اپنی ٹرک لے لی ہے خود مچھلی سمندر سے نکالتے ہیں اپنی ٹرک میں لے جا کر شہر میں بیچتے ہیں، پہلے میرے کان میں ایک چاندی کی بالی نہیں تھی اب دیکھ یہ سونے کا بگڑا، تیری چیڑی پھجڑی بیوی کے پاس بھی ایسا نہ ہوگا۔

پولیس والے اس سے پوچھنے لگے کون تھا وہ؟

وہ بولی وہ میرا بیٹا تھا

ہاں، وہ میرا بیٹا تھا وہ جہازی تھا نا دارسوار میں، جب جہازیوں کی ہڑتال ہوئی، تو اس نے اکیلے پانچ گوروں سے لڑائی کی، تم لوگ نہیں جانتے ہو اور اکھباروں میں بھی یہ کسی کی معلوم نہیں، مگر وہ میرا بیٹا تھا، اور میں نے اپنی آنکھوں سے اسے پانچ گوروں سے لڑتے دیکھا، اور آج جو آدمی یہاں سے بھاگا، وہ بھی میرا بیٹا تھا، کیونکہ وہ بھی اس طرح کی ہڑتال چاہتا تھا جس کے لیے میرا بیٹا مارا گیا اس لیے میں نے اسے بچالیا اب تمہارا جہاں جی چاہے لے چلو۔

پولیس والوں نے اسے گاڑی سے نیچے اتار لیا گاڑی کے چلتے چلتے رمیش نے دیکھا کہ وہ عورت پولیس والے سے ماچس مانگ رہی ہے، ماچس لے کر اس نے اپنی بیڑی سلگائی اور ماچس کی روشنی میں اس کی گہری آنکھوں میں چمک اٹھی، اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے ارد گرد جھریاں گہری ہو گئیں اور طلائی بگڑا اس کے کانوں میں بار بار غصے سے ہلنے لگا، پھر گاڑی آگے نکل گئی۔

رمیش ایک سیٹ پر بیٹھ گیا، اس کے قریب ہی وہ نوجوان جس نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس نوجوان عورت کے قریب بیٹھا ہوا تھا، جس کا رنگین لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ نوجوان رمیش کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا، ''وہ بچ گیا اب ہاتھ نہیں آئے گا''

اس نے سر ہلا دیا میں جانتا ہوں مگر وہ بھی میری طرح کوئی مزدور دکھائی دیتا تھا

رمیش نے پوچھا'' تم مزدور ہو؟'' تمہارے تمہارے کپڑے تو-------

اس نے جواب دیا ہمارا آج ہی بیاہ ہوا ہے یہ بیاہ کے کپڑے تھے، میرے بھی اور اس کے بھی اور اس نے اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔۔ بڑی مشکل سے یہ کپڑے سلائے تھے، خیر کوئی بات نہیں اپنا ساتھی تو بچ گیا۔

وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کے مسکرا دیا اس کی بیوی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے امرود کو اس نے دانتوں سے کاٹا اور لجائی ہوئی دلیری سے اس جوٹھے امرود کو اپنے خاوند کے ہونٹوں پر رکھ

دیا۔

نوجوان مزدور امرود کھانے لگا، اور اس کے مضبوط ہاتھ نے بیوی کو اپنے شانے سے لگالیا۔

رمیش آہستہ سے وہاں سے اٹھ گیا دوسری طرف ڈبے کے قریب مارواڑی اپنی پگڑیاں، اچکنیں اور دھوتیاں درست کر رہے تھے۔

ایک مارواڑی نے اپنی جیب سے تاش نکالتے ہوئے کہا کیا ہوا مچھلی والی نے تاش باہر پھینک دی، ہمارے پاس دوسری تاش ہے۔

رمیش نے مارواڑیوں کے اوپر جھک کے کہا تمہارے پاس صرف ایک تاش ہے لیکن مچھلی والی کے پاس سارا سمندر ہے اور اس کی ساری مچھلیاں ہیں، تم اسے جیت نہیں سکتے۔۔۔

لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے اسپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے، گاڑی کی لے پر موی بتوں کی طرح ہل رہے تھے ان بتوں کے ہاتوں میں اخبار تھے اور چمکیلے امریکی ناول لیے کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی، وہ بھی ایک بے جان آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی، یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا، کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا، یہاں خاموشی تھی اور ایک طویل گہرا سناٹا اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کوئی ہزار سال پرانے مندر میں آنکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆☆☆

پہلا دن

آج نئی ہیروئن کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا

میک اپ روم میں نئی ہیروئن سرخ مخمل کے گدے والے خوبصورت سٹول پر بیٹھی تھی اور ہیڈ میک اپ مین اس کے چہرے کا میک اپ کر رہا تھا۔

ایک اسسٹنٹ اس کے دائیں بازو کا میک اپ کر رہا تھا دوسرا اسسٹنٹ بائیں بازو کا، تیسرا اسسٹنٹ نئی ہیروئن کے پیروں کی آرائش میں مصروف تھا۔

ایک ہیئر ڈریسر عورت اس کے بالوں کو ہولے ہولے کھولنے میں مصروف تھی سامنے سنگار میز پر پیرس، لندن اور ہالی وڈ کا بنا ہوا سنگار کا سامان بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا

ایک وقت وہ تھا، جب نئی ہیروئن کو معمولی جاپانی لپ اسٹک کے لیے بھی ہفتوں اپنے شوہر سے لڑنا پڑتا تھا، اس کا شوہر مدن میک اپ روم کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے یہی سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا کیسی مشکل زندگی تھی ان دونوں کی۔۔۔۔۔۔

آج سے تین سال پہلے مدن دہلی میں کلرک تھا، تھرڈ ڈویژن کلرک، ایک سو ساٹھ روپے تنخواہ پاتا تھا۔

ناداری اور تنگی کی زندگی تھی کبھی کوٹ کا کالر پھٹا ہوا ہے، کبھی قمیض کی آستین کبھی بلاؤز کی پشت۔

آگے پیچھے جدھر سے وہ دہلی کی زندگی دیکھتا تھا۔ اسے وہ زندگی کٹی پھٹی،

بوسیدہ اور تار تار نظر آتی تھی ۔لیکن ایسی زندگی جس میں کوئی آسمان نہیں ہوتا کوئی مسکراہٹ نہیں ہوتی، کوئی پھول نہیں ہوتا ۔

ایسی نیم فاقہ زدہ، جھلاتی کھسیانی زندگی جو ایک پرانی بدبو دار ترپال کی طرح، دنوں، مہینوں اور برسوں کے کھونٹوں سے بندھی ہوئی ہر وقت احساس پر چھائی رہتی تھی مدن اس کے ہر کھونٹے کو توڑنا چاہتا تھا اور کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

یہ موقع اسے **ملک** گردھاری لال نے دے دیا **ملک** گردھاری لال اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ تھا انہیں دنوں دفتر میں اسسٹنٹ کی نئی آسامی منظور ہوئی تھی۔

مدن نے بھی اس کے لیے درخواست دی تھی

مدن سینئر تھا اور لائق بھی تھا

اور **ملک** گردھاری لال کا چہیتا بھی تھا

ملک گردھاری لال نے جب اس کی درخواست پڑھی تو اسے اپنے پاس بلایا اور کہا

''مدن تمہاری عرضی میں کئی نقص ہیں''

''تو آپ ہی کوئی گر بتائیے''

ملک گردھاری لال نے قدرے توقف کے بعد مدن کی عرضی اسے واپس کرتے ہوئے کہا

''آج رات میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا''

مدن بے حد خوش ہوا۔گھر جا کے اس نے اپنی بیوی پریم لتا سے خاص طور پر اچھا کھانا تیار کرنے کی فرمائش کی

پریم لتا نے بڑی محنت سے روغن جوش پنیر مٹر آلو گوبھی اور گھیوں والا پلاؤ تیار کیا۔

سر شام ہی ملک گردھاری لال مدن کے گھر آ گیا اور ساتھ ہی وہسکی کی ایک بوتل بھی لیتا آیا۔

پریم لتا نے جلدی سے پاپڑ تلے

بیسن اور پیاز کے پکوڑے تیار کیے اور پلیٹوں میں سجا کر بیچ بیچ میں خود آ کر انہیں پیش کرتی رہی۔

چوتھے پیگ پر وہ پالک کے ساگ والی پھلکیاں پلیٹ میں سجا کر لوئی تو ملک گردھاری لال نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا

پریم لتا تو بھی بیٹھ جا

آج ہمارے ساتھ وہسکی کی ایک چسکی لگا لے تیرا پتی میرا اسسٹنٹ ہونے والا ہے پریم لتا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی

اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے کیوں کہ آج تک اس کے خاوند کے سوا کسی نے اسے اس طرح ہاتھ نہ لگایا تھا۔

پھلکیوں کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی

مدن نے گرج کر کہا

''ملک گردھاری لال! میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی ہمت تجھے کیسے ہوئی؟''

مدن کا چانس مارا گیا

اس کی بجائے سردار اوتار سنگھ اسسٹنٹ بھی بن گیا۔ پھر چند دن بعد کسی معمولی

غلطی کی بناپر مدن کونوکری سے الگ کر دیا گیا۔

اس نے کئی مہینوں تک دہلی کے دفتروں میں ٹکریں مارنے کے بعد بمبئی آنے کی ٹھانی کیوں کہ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی

مدن کے دوستوں کا خیال تھا کہ پریم لتا اتنی ہی حسین ہے جتنی کہ نسیم ''پکار'' میں تھی

وحیدہ رحمان ''پیاسا'' میں تھی

مدھوبالا ''مغل اعظم'' میں تھی

اس لیے مدن کو چاہیے کہ پریم لتا کو بمبئی لے جائے

دہلی میں خوبصورت بیوی والے مرد کی ترقی کے لیے گنجائش ہی کتنی ہے؟

مدن اگر اسسٹنٹ بن بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی روپلی ملا کرتے، ایک سو ساٹھ کے بجائے ڈھائی سو روپے۔

یعنی محض نوے کے لیے وہ اپنی عزت گنوا دیتا؟ یہ سراسر حماقت ہوتی ہے اس لیے دوستوں نے مشورہ دیا کہ مدن کو فوراً بمبئی جانا چاہیے۔

مگر جب مدن نے پریم لتا سے بمبئی جانے کا ذکر کیا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی

وہ سیدھی سادھی گھریلو لڑکی تھی اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، کپڑے دھونا، جھاڑو دینا اور اپنے شوہر کے لئے سوئٹر بننا بہت پسند تھا وہ چودہ روپے کی ساڑھی اور دو روپے کے بلاؤز میں بے حد خوش اور مگن تھی۔

اس نے ضد کی کہ وہ کبھی بمبئی نہیں جائے گی وہ کسی سکول میں کام کرلے گی مگر

بمبئی نہیں جائے گی۔

دو تین دن تو مدن اسے سمجھاتا رہا جب وہ کسی طرح نہ مانی تو وہ اسے پیٹنے لگا دو دن چار چوٹ کی مار کھا کر پریم لتا سیدھی ہوگئی اور بمبئی جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

جب پریم لتا اور مدن بوری بندر کے اسٹیشن پر اترے تو ان کے پاس ایک بستر تھا، دو سوٹ کیس تھے، چند سو روپے تھے۔

اور پریم لتا کے جہیز کا زیور تھا کچھ دن وہ لوگ کالیا دیوی کے ایک دھرم شالا میں رہے اور مکان ڈھونڈتے رہے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ جتنے کا زیور پریم لتا کے پاس ہے اور جتنے روپے مدن کے پاس ہیں کل مل کر بھی اتنے نہیں ہو سکتے کہ بمبئی میں پگڑی دے کر ایک مکان لیا جا سکے تو وہ لوگ دھرم شالا سے گورے گاؤں کی ایک جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر مدن کی لڑائی جھونپڑی میں رہنے والے ایک غنڈے سے ہوئی جو شراب پی کر پریم لتا کی عزت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

اس لڑائی کے ایک زخم کا نشان آج بھی مدن کی کلائی پر موجود تھا مگر مدن نے بڑی بہادری اور جی داری سے لڑ کر جھونپڑیوں میں باعزت طریقے سے رہنے کا حق منوالیا تھا۔

کیونکہ جھونپڑیوں میں رہنے والے بنیادی طور پر غریب تھے اور ایک دوسرے کے حق کو جلد تسلیم کر لیتے تھے۔

اب مدن نے پریم لتا کو ساتھ لے کر ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کے چکر

لگانے شروع کر دیئے

دن گزر گئے مہینے گزر گئے، چکر لگاتے لگاتے فاقے شروع ہو گئے پہلے نقدی ختم ہوئی۔

پھر پریم لتا کے زیور بکے، پھر قیمتی ساڑھیاں، پھر کم قیمت ساڑھیاں، آخر میں مدن کے پاس صرف ایک قمیض اور پتلون رہ گئی جو اس کے بدن پر تھی اور پریم لتا کے پاس صرف ساڑھی اور بلاؤز تھا اور وہ بھی پشت سے پھٹ گیا تھا۔

"آپ کا ڈریس آیا ہے"

ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اندر آ کر زور سے کہا اور مدن اپنے خواب سے جاگ گیا اس نے دیکھا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ساتھ ایک درزی ہیروئن کی نئی پوشاک لے کر آیا ہے۔

جامنی رنگ کا اطلسی غرارہ، زردوزی کے کام کا بنارسی کرتا۔ اور بلو شفان کا دوپٹہ، سنہری گوٹے کی لہروں سے جھلمل جھلمل کرتا ہوا! لباس کے اندر آتے ہی یوں محسوس ہوا گویا میک اپ روم میں ایک فانوس روشن ہو گیا۔

میک اپ ختم کر کے ہیروئن ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے کے لیے چلی گئی لیڈی ہیئر ڈریسر اور دو خادمائیں اس کے جلو میں تھیں

اسے یوں جاتے دیکھ کر مدن کے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسی دن کے لیے اس نے اتنی جدوجہد کی تھی اسی دن کے لیے وہ جیا تھا اسی دن کے لیے اس نے فاقے کیے تھے چنے کھا کر میلی پتلون اور میلی قمیض پہن کر تپتی دوپہروں، موسلا دھار بارش کی شاموں میں وہ پروڈیوسروں کے دفتروں اور

گھروں کے چکر لگاتا رہا تھا۔آج کامیابی کا پہلا دن تھا اس کامیابی کی پہلی سیڑھی اسے چمن بھائی نے سمجھائی تھی۔

چمن بھائی فلم پروڈیوسروں کو کرایہ پر ڈریس سپلائی کیا کرتا تھا۔اکثر اوقات وہ کسی پروڈیوسر کے دفتر میں یا کسی سٹوڈیو میں مدن کو مل جاتا تھا۔ایک دن جب مدن اس طرح پھٹے حالوں گھوم رہا تھا چمن بھائی نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا

''کہیں کام بنا؟''

''نہیں''

''تم نرے گدھے ہو''

اب مدن نے گالی سن کر بھی خاموش رہنا سیکھ لیا تھا اسی لیے وہ خاموش رہا۔

دیر تک چمن بھائی بڑے غصے میں اس کی طرف گھورتا رہا آخر بولا''آج شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں کچھ گر کی باتیں بتاؤں گا''

پریم لتا نے اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے پھٹے سے آنچل سے اپنی جوانی ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی پھر اس نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی ملک گردھاری لال مل جاتا ہے

مگر اس شام کو چمن بھائی نے ان کے جھونپڑے میں بیٹھ کر کاجو پیتے ہوئے کوئی نامناسب حرکت نہیں کی البتہ پانچویں پیگ کے بعد ایک دم بھڑک کر بولا جب تک پریم لتا تمہاری بیوی رہے گی یہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔

''کیا بکتے ہو؟''مدن غصے سے چلا کر بولا

''ٹھیک بکتاہوں''چمن بھائی ہاتھ ہلاکر زوردار لہجہ میں بولا

''سالا ہلکٹ کس کو تمہاری بیوی دیکھنے کی چاہت ہے سب لوگ مل مجور سے لے کر مل مالک تک فلم کی ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتے ہیں''

''کنواری؟''

''ایک دم ورجن؟''

''مگر میری بیوی کنواری کیسے ہوسکتی ہے؟وہ تو شادی شدہ ہے''

''تو اس کی شادی والی بات مت بولو کنواری بولو اپنی بیوی مت بولو بولو یہ لڑکی میری بہن۔''

''میری بہن؟''مدن نے حیرت سے پوچھا

''ہاں ہاں تمہاری بہن۔۔۔۔۔ارے بابا کون تمہاری جھونپڑے میں دیکھنے آتا ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے کہ بیوی ہے مگر دنیا کو بولو کہ یہ تمہاری بہن ہے پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟''

چمن بھائی یہ گر بتا کر چلا گیا مگر پریم لتا نہیں مانی مدن کے بار بار سمجھانے پر بھی نہیں مانی

''میں اپنے شوہر کو اپنا سگا بھائی بتاؤں گی؟ ہر گز نہیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا!اس سے پہلے میں مر جاؤں گی تم میری زبان گدی سے باہر کھینچ لوگے جب بھی اپنے پتی کو اپنا بھائی نہیں کہوں گی''

آخر مدن کو پھر پیٹنا پڑا دو دن پریم لتا نے چار چوٹ کی مار کھائی تو سیدھی ہوگئی اور فلم پروڈیوسروں کے دفتروں میں جا کر اپنے شوہر کو اپنا بھائی بتانے لگی۔

چمن بھائی نے مدن کو اپنے ایک دوست پروڈیوسر چھگن بھائی سے ملوا دیا چھگن بھائی نے پریم لتا کے فوٹو ایک کمرشل سٹوڈیو سے نکلوائے اور اپنے ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ کو بلوا کر پریم لتا سے اس کا تعارف کرایا مرزا عزت بیگ نے بڑی گہری نظروں سے پریم لتا کو دیکھا اس سے بات چیت کی پھر سکرین ٹیسٹ کے لیے ہاں کر دی۔

سکرین ٹیسٹ کے لیے فلم کا ایک سین پریم لتا کو یاد کرنے کے لیے دیا گیا تین دن کے بعد سکرین ٹیسٹ رکھا گیا تینوں دن ہر روز شام کے وقت چمن بھائی جھونپڑے میں مدن اور پریم لتا سے ملنے کے لیے آتا رہا اور کاجو پیتا رہا اور ان دونوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

تیسرے دن چمن بھائی نے مدن سے کہا ''آج سکرین ٹیسٹ ہے میری مانو تو آج تم پریم لتا کے ساتھ نہ جاؤ''

''کیوں نہ جاؤں؟''

''اس لیے اگر تم ساتھ گئے تو پریم لتا فری ایکٹنگ نہ کر سکے گی تمہیں دیکھ کر شرما جائے گی اور گھبرا جائے گی اور اگر پریم لتا گھبرا گئی تو سکرین ٹیسٹ میں فیل ہو جائے گی''

''کیسے فیل ہو جائے گی؟'' مدن شراب کے نشے میں جھلا کر بولا

''میری بیوی نسیم، سچرا سین، مدھوبالا سے بھی زیادہ خوبصورت ہے میری بیوی الزبتھ ٹیلر سے بھی زیادہ خوبصورت ہے میری بیوی نرگس سے بہتر ادا کارہ ہے میری بیوی کسی سکرین ٹیسٹ میں فیل نہیں ہو سکتی میری بیوی''

''ابے سالے بیوی نہیں، بہن بول بہن!'' چمن بھائی نے ہاتھ چلاتے ہوئے زور سے کہا۔

''اچھا بہن ہی سہی'' مدن شراب کے جام خالی کرتے ہوئے بولا'' جیسا تم بولو گے چمن بھائی ایسا ہی کروں گا آج تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے جواب ٹالوں گا لے جاؤ میرے بھائی، اپنی بہن کو تم، آج سکرین ٹیسٹ کے لیے جاؤ مگر حفاظت سے واپس پہنچا دینا''

''کھاطری رکھو'' چمن بولا'' اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا ہوں اپنی گاڑی میں لے کر آؤں گا''

''بہت رات گئے پریم لتا سکرین ٹیسٹ سے پروڈیوسر کی گاڑی میں لوٹی اس نے وہی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جو سکرین ٹیسٹ کے لیے استعمال کی گئی تھی اور اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔''

مدن غصے سے پاگل ہو گیا'' تم نے شراب پی؟''

''ہاں! سین میں ایسا ہی کرنا تھا''

''مگر پہلے سین میں، جو تمہیں دیا گیا تھا، اس میں تو ایسا نہیں تھا''

''مرزا عزت بیگ نے سین بدل دیا تھا''

''تو تم نے شراب پی صرف شراب پی؟ مدن نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا''

''ہاں صرف شراب پی''

''اور تو کچھ نہیں ہوا؟''

''نہیں'' پریم لتا بولی البتہ سین کی ریہرسل الگ سے کراتے ہوئے مرزا عزت بیگ نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا

''کمر میں ہاتھ ڈال دیا'' مدن پھر بھڑک کر بولا

''سین کا ایکشن سمجھانے کی خاطر'' پریم لتا بولی

مدن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا آہستہ سے بولا ''صرف کمر میں ہاتھ ڈالا عزت پر ہاتھ تو نہیں ڈالا؟''

''نہیں'' پریم لتا نے نظریں چرا کر کہا

''صاف بتاؤ اور تو کچھ نہیں ہوا؟''

''ہاں ہوا تھا'' پریم لتا جھجکتے جھجکتے بولی

''کیا ہوا تھا؟'' مدن پھر پھڑ کنے لگا

''سکرین ٹیسٹ کے دوران میں وہ جو میرے سامنے ہیرو کا کام کر رہا تھا اس نے مجھے زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا''

''ایسا اس بدمعاش نے کیوں کیا؟'' مدن گرج کر بولا

''سین ہی ایسا تھا'' پریم لتا بولی

''اچھا سین ہی ایسا تھا'' مدن اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بولا ''جب سین ہی ایسا تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔۔۔۔۔مگر ٹھیک ٹھیک بتاؤ صرف بانہوں میں بھینچا تھا؟''

''ہاں صرف بانہوں میں لے کر بھینچا تھا پریم لتا گلوگیر لہجے میں بولی پھر یکا یک بستر پر گر کر تکیہ میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی''

''شارٹ تیار ہے''

یہ پروڈیوسر چھگن بھائی کی آواز تھی، مدن اس آواز کو سن کر چونک گیا اور بے اختیار کرسی سے اٹھ گیا چھگن بھائی مدن کو دیکھ کر مسکرایا ہاتھ بڑھا کر اس نے مدن سے مصافحہ کیا بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے پوچھا'' سروج بالا کدھر ہے؟'' چھگن بھائی نے اپنی نئی ہیروئن کا نام پریم لتا سے بدل کر سروج بالا رکھ دیا تھا۔ بیشتر اس کے مدن کوئی جواب دے نئی ہیروئن خود ہی ڈریسنگ روم سے نکل کر خراماں خراماں میک اپ روم میں چلی گئی اور نئے لباس، نئے سٹائل اور مکمل میک اپ کے ساتھ قدم قدم پر ایک فتنہ جگاتی ہوئی آئی۔

چند لمحوں تک تو مدن مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا گویا اسے یقین نہ ہو کہ یہ عورت اس کی بیوی پریم لتا ہے چھگن بھائی بھی ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا اور اس ایک لمحے میں اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ اس نے جو فیصلے کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔

دوسرے لمحے چھگن بھائی نے تھیٹریکل انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں کہنے لگا''شارٹ تیار ہے سرکار والی سیٹ پر تشریف لے چلئے''

نئی ہیروئن کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مدن کو ایسے لگا جیسے کسی شاہی ہال میں لٹکے ہوئے استنبولی فانوس کی بہت سی بلوریں قلمیں ایک ساتھ بج اٹھیں، نئی ہیروئن مسکراہٹ کے موتی بکھیرتی ہوئی چھگن بھائی کے ساتھ سیٹ پر چلی۔

مدن بھی پیچھے پیچھے چلا اور چھگن بھائی کو اپنی بیوی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر مدن کو وہ دن یاد آ گیا۔ جب چھگن بھائی نے سکرین ٹیسٹ کے چند دن بعد مدن کو اپنے دفتر بلا بھیجا تھا۔

مدن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چھگن بھائی خود اسے اندر کمرے میں لے گیا تھا۔ جو ائیر کنڈیشنڈ تھا اور چھگن کا خاص پرائیویٹ کمرہ تھا بزنس کے تمام اہم امور اسی میں طے ہوئے تھے جب مدن اس کمرے کے اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس سے پہلے کمرے اس کمرے میں مرزا عزت بیگ اور چمن بھائی آئے ہوئے بیٹھے ہیں

''آج بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے'' چمن بھائی نے ہنس کر کہا

''آج ہم ایک سونے کی کان خریدنے والے ہیں''

''سونے کی کان''

مدن نے تعجب سے پوچھا

''ہاں اور تمہارا بھی اس میں حصہ ہے۔۔۔۔۔ایک چوتھائی کا اور تین تمہارے پارٹنر تمہارے سامنے اس کمرے میں بیٹھے ہیں میں، چھگن بھائی، یہ میرا دوست چمن بھائی، یہ میرا ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ ہم چاروں آج سے اس سونے کی کان کے پارٹنر ہوں گے''

''اور یہ سونے کی کان ہے کہاں؟''

چھگن بھائی نے جواب میں میز سے ایک تصویر اٹھائی اور مدن کو دکھاتے ہوئے بولا

''یہ رہی''

یہ پریم لتا کی تصویر تھی

مدن نے حیرت سے کہا ''مگر یہ تو میری بی۔۔۔۔میرا مطلب ہے میری

بہن کی تصویر ہے۔''

''یہی تو سونے کی کان ہے تمہاری بہن کو اپنی پکچر میں ہیروئن لے رہا ہوں اور انڈسٹری کے ٹاپ ہیرو دیوراج کے سنگ جس کی کوئی تصویر سلور جوبلی سے ادھر اتر تی ہی نہیں بولو؟ پھر ایک پکچر کے بعد اسی ہیروئن کی قیمت ڈھائی لاکھ ہوگی کہ نہیں؟ بولو؟ اس کو میں سونے کی کان بولتا ہوں تو کیا غلط بولتا ہوں؟ جواب دو''

''مگر میں پوچھتا ہوں میری سونے کی کان آپ کی کیسے ہوگئی؟'' مدن نے حیران ہوکر پوچھا۔

''کیونکہ میں اسے ہیروئن لے رہا ہوں'' چھگن بلند آواز سے بولا

''نہ لوں تو یہ لڑکی کیا ہے؟ گورے گاؤں کے جھونپڑے میں رہنے والی، پندرہ روپے کی چھوکری۔''

پھر میں اس کی پبلسٹی پر پچھتر ہزار روپیہ خرچ کروں گا کہ نہیں؟ پھر میں اس کو ٹاپ کے ہیرو دیوراج کے سنگ ڈال رہا ہوں کہ نہیں؟ اس کے بعد اگر میں اس کان میں آدھو آدھ شیئر مانگتا ہوں تو کیا زیادہ مانگتا ہوں؟ اور وہ بھی صرف پانچ سال کے لیے

''اور تم؟'' مدن نے چمن بھائی سے پوچھا

''اگر میں چھگن بھائی سے نہ ملاتا تو تمہیں یہ کانٹریکٹ آج کہاں سے ملتا اس لیے حساب سے ساڑھے بارہ فیصدی کا کمیشن میرا ہے''

''اپن تو ڈائریکٹر ہے'' مرزا عزت بیگ بولا ''اپن چاہے تو اس پکچر میں نئی ہیروئن کو فرسٹ کلاس بنا دے، چاہے تو تھرڈ کلاس بنا دے۔ اس لیے اپن کو بھی

ساڑھے بارہ فیصد چاہیے۔''

''مگر یہ تو بلیک میل ہے''یکا یک مدن بھڑک کر بولا

''عزت کی بات کرو عزت کی''عزت بیگ خفا ہو کر بولا''اپن اپنی عزت ہمیشہ بیگ میں رکھتا ہے اس لیے اپن کا نام عزت بیگ ہے اپن عزت چاہتا ہے اور اپنا شیئر ساڑھے بارہ فیصدی!''

یکا یک مدن کو ایسا محسوس ہوا جیسے پریم لتا کوئی عورت نہیں ہے، وہ ایک کاروباری تجارتی ادارہ ہے جس کے شیئر بمبئی کی سٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کے لیے آ گئے ہیں جیسے گلوب کمبائن، الکائن اور ٹاٹا ڈیفرڈ ایسے ہی پریم لتا پرائیویٹ لمیٹڈ۔۔۔۔

''مجھے کہاں دستخط کرنے ہوں گے؟''مدن نے تقریباً روہانسا ہو کر پوچھا

۔۔۔۔۔۔فاقوں کے ماہ و سال ماضی کا حصہ بن چکے تھے جس دن مدن نے کانٹریکٹ پر دستخط کیے چھگن بھائی نے اسے دو ہزار کا چیک دیا مالا بار ہل پر ان کے رہنے کے لیے ایک عمدہ فلیٹ ٹھیک کرا دیا ایک نئی فیاٹ گلوب موٹرز کی دکان سے نکلوا کے دے دی۔

اسی رات مدن اور پریم لتا اپنے نئے فلیٹ میں چلے گئے اور مدن نے پریم لتا کو گلے سے لگا کر اس کی کامیابی کے دعا کی اور مدن کے پیروں کو چھو کر پریم لتا نے بر تگیا کی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صرف اس کی ہو کے رہے گی۔

آخر کار مدن کی محنت اور جدوجہد رنگ لائی آخر کار کامیابی نے مدن کے پیر چومے آج اس کی بیوی ہیروئن تھی پریم لتا سر وج بالا تھی اور آج شوٹنگ کا پہلا دن

تھا

اور اب وہ دن بھی ختم ہو رہا تھا سٹیج نمبر ایک کے باہر مدن اپنی فیاٹ میں بیٹھا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا کب پانچ بجیں گے، کب پیک اپ ہوگا اور کب وہ اپنی دل کی رانی کو اپنی فیاٹ میں بٹھا کر دور کہیں سمندر کے کنارے ڈرائیور کے لیے لے جائے گا۔

میک اپ کی گھنٹی بجی مدن کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا تھوڑی دیر کے بعد نئی ہیروئن باہر نکلی اس کا ہاتھ ہیرو کے ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ہاتھ جھلاتے ساتھ ساتھ چلے آر ہے تھے ساتھ ساتھ وہ فیاٹ سے آگے چلے گئے جہاں ہیروں کی شاندار امپالا گاڑی کھڑی تھی۔

مدن نے فیاٹ کا پٹ کھول کر آواز دی

''سروج''

''ہاں بھیا!'' ہیروئن پلٹ کر چلائی اور پھر دوڑتی ہوئی مدن کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی ''تم گھر جاؤ، میں دیوراج کی گاڑی میں آتی ہوں''

''مگر میری گاڑی میں کیوں نہیں جا سکتیں؟'' مدن نے غصے سے پوچھا

''باولے ہو گئے ہو!'' پریم لتا نے طیش کھا کر جواب دیا

''اب میں ایک ہیروئن ہوں اب میں کیسے تمہارے ساتھ چھوٹی سی فیاٹ میں بیٹھ کر سٹوڈیو سے نکل سکتی ہوں لوگ مجھے کیا کہیں گے؟''

''سروج'' ہیرو زور سے چلایا

''آئی'' سروج بھی زور سے چلائی، اور پلٹ کر ہیرو کی گاڑی کی طرف دوڑتی

ہوئی چلی گئی۔ دیوراج سامنے کی سیٹ پر ڈرائیو کرنے کے لیے بیٹھ گیا اور سروج اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی پھر امپالا کے پٹ بند ہو گئے اور وہ خوب صورت زمردی گاڑی ایک خوش آہنگ ہارن کی موسیقی پیدا کرتی ہوئی گیٹ سے باہر چلی گئی اور مدن کی فیاٹ کا پٹ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆

پہلی اڑان

جب سرکار نے عبداللہ کو ساگرہ میں پرائمری اسکول کھولنے کے لیے بھیجا تھا تو سب سے پہلے جس لڑکے نے اسکول میں داخل ہونے پر رضامندی ظاہر کی، وہ گلاب تھا گاؤں کا یتیم اپنے چچا ست نرائن کی ریشہ دوانیوں کا شکار وہ بہت جلد عبداللہ اور اس کی بیوی بتول سے مانوس ہوگیا اور خاص کر جب بتول نے اس سے شرارت آمیز لہجہ میں کہا، اورتم گلاب تم میرے نام پر ہنستے ہو اپنے نام کے متعلق کیا خیال ہے، تمہارا نام تو ایسا ہے جیسے کسی مسلمان کا ہو۔۔۔گلاب۔۔۔گلاب؟ بھلا گلاب بھی کسی برہمن کا نام ہوسکتا ہے گلاب یہ سن کر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا

پہلے پہل عبداللہ کو پرائمری سکول کے لیے لڑکے اکٹھے کرنے میں بڑی دقت پیش آئی چند دنوں تک وہ بچارا اکیلا اسکول میں بیٹھا رہا چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں پہاڑوں پر ڈنگر ڈھور لے جاتے، روزمرہ کا راستہ چھوڑ کر اسکول کی راہ لیتے اور حیرت اور شوخی اور شرارت کے ملے جلے جذبات سے ماسٹر عبداللہ کی طرف دیکھتے جو ان کے ماں باپ کی طرح فرغل اور اونی چولا بھی نہیں پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے بال بھی بھیڑ کی اون کی طرح نہیں کٹے ہوئے تھے وہ کھدر کی ایک شلوار اور قمیض پہنے ہوئے تھا اور قمیض کے اوپر اس نے ایک کوٹ پہن رکھا تھا، جو فرغل کے نصف سے بھی کم تھا، اور جس پر نہایت دلفریب چوکور دھاریاں بنی ہوئی تھیں، ہاہاہا اور اس کی لمبی ناک۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔۔

''ارے یہ ناک ہے یا گھسی ہوئی پول؟''
''ارے یہ مچھی مار کی چونچ ہے!''
''نہیں یہ بوڑھے دادا کی ہک والی چھڑی ہے دیکھو نا بالکل اسی طرح ہے''
''بالکل بجو معلوم ہوتا ہے''
''چلو بھاگو، میاں نہیں تو پٹو گے۔''

پول کشمیری دھان کی بنی ہوئی چپک کو کہتے ہیں جسے غریب کسان اور مزدور لوگ پہنتے ہیں

''دھا دھا نیلی تو مر جائے ادھر مت جا ادھر ماسٹر جی بیٹھے ہیں ہش ہا، سونی، کمبخت کدھر جاتی ہے، یہ سکول ہے'' اور اس طرح ہنستے اور مذاق کرتے ہوئے چرواہے اور چرواہیاں ریوڑوں کو ہنکاتے جنگل کو ہوئے چلے جاتے۔ عبداللہ کڑھتا، مسکراتا، چیں بجیں ہوتا لیکن کیا کرتا ابھی پچھلے سال اس نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا آگے پڑھنے کا حوصل نہ تھا اب بیوی بھی تھی جب تک وہ میٹرک میں پڑھتا رہا اس کے سسر نے باکمال مہربانی بتول کو اپنے گھر پناہ دی تھی لیکن اب اس کی بےفکری کی زندگی ختم ہو چکی تھی وہ اسکول میں سب سے ذہین لڑکا تھا لیکن آگے پڑھائی جاری رکھنے کے لیے صرف ذہانت کام نہیں دے سکتی تھی کالج کی پڑھائی کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ بےحد کفایت کے بعد بھی اس غریب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کالج میں پڑھ سکے ہار مان کر اس نے محکمہ تعلیم میں ملازمت

قبول کر لی تھی اور قبول کرنے کا کیا سوال تھا اسے یہ ملازمت بھی بہت دشواریوں کے بعد ملی تھی دس روپے تنخواہ تھی اور دو فرد تھے، ایک عبداللہ دوسرے بتول کئی بار عبداللہ کو خیال آیا کہ اگر وہ ان پڑھ کسان کا ان پڑھ بیٹا ہی رہتا تو شاید اس کی زندگی بہتر ہوتی۔ لیکن تعلیم نے اسے اب زندگی کی اس منزل پر پہنچا دیا تھا، جہاں سے وہ پیچھے ہٹنا نہ چاہتا تھا یہ خودکشی ہوتی، بتول اسے بہت پیاری تھی ایسی محبت اسے ماں باپ سے بھی نہ ہوئی تھی، لیکن دس روپے میں وہ اسے شال دوشالے نہ اڑھا سکتا تھا وہ کھدر کے کپڑے جو وہ خود پہنتا تھا۔ اسی کھدر سے بتول کی قمیض اور شلواریں بنتی تھی بتول کو اس نے خود تعلیم دی تھی اور ہوشیار لڑکی بہت جلد اردو، انگریزی، حساب اور جغرافیہ سیکھ گئی تھی، تواریخ اسے پسند نہ تھی بادشاہوں کے نام اور سمت یاد کرنے سے کیا فائدہ تعلیم نے عبداللہ کو اپنی موجودہ زندگی سے بےحد متنفر کر دیا تھا اور اخباروں کے پڑھنے سے اس کے خیالات خطرناک طور پر سیاسی ہو گئے تھے لیکن پیٹ بری بلا ہے، اور اب اس کی اولوالعزمی، فطرتی ذہانت اور ترقی کی راہیں سب مسدود ہوئی جا رہی تھیں، لیکن بتول پڑھ کر زیادہ وفا شعار، خدمت گزار، اور فراخ دل ہوگئی تھی پہلے وہ زیوروں کے لیے تقاضا کیا کرتی تھی اب اسے اپنے کانوں میں چاندی کی بالیں بری معلوم ہوئیں اور اس نے انہیں اتار دیا۔ ناک کی بڑی لونگ، چاندی کی انہیل اور کلائیوں میں پڑے ہوئے چاندی کے کڑے سب اتر گئے تھے شاید وہ سونے کے پتلے پتلے بانکے زیور پہن لیتی لیکن سونا حاصل کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا الہ دین کا چراغ اسی لیے تو اب اس کے گدرائے ہوئے بازو ننگے تھے، اور ستواں ناک، روپہلی تکیل کے بغیر، لیکن

بتول نے شیشے میں یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ زیور اتار دینے سے اس کی شکل نکل آئی ہے، اور اس کی خوبصورتی پہلے سے دوچند ہوگئی ہے ساگرہ میں آنے کے چند دنوں کے بعد اس نے عبداللہ کو صلاح دی کہ وہ خود ہر گاؤں کے نمبردار کے پاس جائے بلکہ اگر ہو سکے تو ہر ایک کسان کے پاس جائے، اور اس سے کہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کرے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے یہ کسان اس کے اپنے بھائی ہیں اور رہم اور وہ کوئی دو نہیں اور اسکول کی یہی حالت رہی تو شاید ساگرہ کا پرائمری سکول ہی بند کر دیا جائے اور کسی طرح اور ماسٹر صاحب کو یہاں آنے کی ترغیب دی جائے بہرصورت اس طرح چپ چاپ بید کی کرسی پر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔

عبداللہ دل میں بہت کڑھا تعلیم کے فائدے اس نے کتابوں میں اتنی بار پڑھے، کہ اس کا یقین تھا کہ جوں ہی اس کا اسکول کھلے گا کسانوں کے لڑکے خود بخود بھاگتے چلے آئیں گے، اور ان کے ماں باپ اس کی منتیں خوشامدیں کر کے انہیں اسکول میں داخل کرائیں گے، لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا یہاں ماسٹر جی کو کاسہ گدائی لے کر گھومنا پڑے گا کہ خدارا اپنے لڑکوں کو اسکول میں داخل کراؤ فیس معاف ہو گی، جب چاہو چھٹی ملے گی۔ قاعدے مفت ملیں گے خدارا اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کراؤ نہیں تو ایک ماسٹر کی روزی چھن جائے گی۔

دو چار گھومنے کے بعد عبداللہ کو پتہ چلا کہ اس میں کسانوں کا بہت قصور نہ تھا صدیوں سے کسانوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ ان کا کام بیج بونا اور فصل کاٹنا اور مالک کی اطاعت کرنا اور بس، پڑھنا صرف چند اشخاص کا کام تھا، اور جو کوئی

دوسرا پڑھے یا پڑھنے کا ارادہ کرے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے ۔ یہ تو برہمن کسانوں کا حال تھا اور مسلمان کسانوں میں بھی مولوی نے تعلیم کے معاملے میں انی خود غرض آمریت کا ثبوت دیا تھا وہ چند لڑکوں کو قرآن مجید کے ایک دو سپارے رٹا دیتا اور بس باقی کام وہ نقش سلیمانی اور اسم اعظم کے تعویذ دے کر پورا کر دیتا تھا۔ ان حالات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے کسان کا دل اور ضمیر تعلیم سے خائف رہا اور اسے سچ مچ بیج بونے، فصل کاٹنے اور مالک کی اطاعت کرنے سے کبھی فرصت نہ ملی کہ وہ گردوپیش کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکتا اور عبداللہ نے سوچا کہ وہ کسانوں کو گردوپیش کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے اسباب پیدا کر کے غیر شعوری طور پر چند خطرناک نتائج کے قریب لانے ذمہ دار بن رہا تھا یہ جان کر اسے ایک گونہ خوشی ہوئی اور وہ اور بھی انہماک سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا، اور اس نے کسانوں کو ترغیبیں دے دے کر اور سبز باغ دکھا کر بہت سے لڑکوں کو اپنے اسکول میں داخل کروالیا۔

ساگرہ میں جس لڑکے نے سب سے پہلے اسکول میں داخل ہونے کی استدعا کی وہ گلاب تھا۔ لیکن گلاب کو اسکول جانا کبھی نصیب نہ ہوا ست نرائن نے محسوس کیا کہ گلاب کا اسکول میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا کالے حرف پڑھ کر گلاب اپنی زمین اور دکان واپس لینے کا تقاضا کر سکتا تھا، اور پھر مویشی خانے کا کام کون سنبھالے گا۔ ریوڑ کون چرائے گا، دودھ کون دوہے گا اور ایسے ایسے بہت سے کام جو گلاب کرتا تھا، کون کرے گا۔ نہیں، وہ گلاب کو اسکول میں نہیں بھیج سکتا تھا ہاں اس نے اپنے سب سے چھوٹے دو لڑکے اسکول بھیج دیئے گلاب کو بہت

اداسی ہوئی اس کا دل عبداللہ کو بید کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بےقرار ہو گیا تھا کاش وہ بھی ایک اسکول ماسٹر بن سکتا اور چارخانے والا اونی کوٹ پہن کر اسی گاؤں کے سب لڑکوں کو پتلی چھڑی سے پیٹ سکتا۔ اسے گاؤں سے دن بدن نفرت ہوتی جا رہی تھی یہ گاؤں جہاں سے درگا سے محبت نہ کر سکتا تھا یہ گاؤں جہاں وہ اسکول میں داخل نہ ہو سکتا تھا لیکن یہی گاؤں اس کی دنیا تھی اور صدیوں سے اس کی جڑیں اسی زمین میں تھیں اور وہ کہیں اور نہ جا سکتا تھا باہر کی دنیا سے وہ ناواقف تھا اسی لیے باہر کی دنیا اسے ڈراؤنی اور خوفناک معلوم ہوتی تھی اسی لیے تو اس کے قدم اب تک ست نارائن کے مویشی خانے کے اندر رکے ہوئے تھے۔

لیکن نفرت کے اس پودے کو جو خود بخود حالات سازگار ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اگ آیا تھا، بتول نے بڑی محبت اور محنت سے پالا بتول نے کہیں سے گلاب کی رام کہانی سن لی، اور جب عبداللہ نے اسے بتایا کہ کسی طرح ست نارائن گلاب کو اسکول میں داخل کرانے پر راضی نہیں ہوتا تھا، تو وہ گلاب کی تعلیم و تربیت پر تل گئی۔

گلاب بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو گیا۔ گلاب کی عمر اس وقت چودہ برس تھی اور بتول اس سے بمشکل چار پانچ سال بڑی ہو گی لیکن بتول کی عقل اس کی عمر سے کہیں بڑی تھی بتول نے گلاب سے کہا ”کوئی مضائقہ نہیں، اگر تم اسکول میں داخل نہیں ہو سکتے، نہ سہی تم میرے پاس اس وقت آ جایا کرو، جب تمہیں فرصت ملے، میں پڑھا دیا کروں گی“

اور بتول نے تین سال سچ مچ اسے نہایت محنت اور شفقت سے پڑھایا اور

گلاب نے بتول کی شفقت میں، ماں بھائی اور بہن کی الفت کا پہلی اور آخری بار مزہ چکھا، اور وہ اس سے بھائیوں کی طرح لڑتی، بڑی بہنوں کی طرح جھڑکتی اور اکثر لمحوں میں اپنے سلوک سے اپنی دبی ہوئی فطری مامتا کی جھلک دکھا کر گلاب کے دل کو شاد کر دیتی تھی بے شک اس محبت میں درگا کی محبت کی سی جنسیت، گہرائی اور تڑپ نہ تھی اور نہ ہی حقیقی ماں کا سا انوکھا پیار، لیکن گلاب کے لیے جسے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہ تھی اور جسے حسن و عشق کے آسمانوں پر اڑتے دیکھ کر درگا نے اس کا ریتلا کنارا دکھا دیا تھا، یہی محبت بہت تھی اسی محبت نے اس کے دل میں ساری زندگی پھر انسانیت کا ایمان تازہ رکھا اور وہ اکثر سوچتا کہ بتول لڑکپن میں اس کے جذبات کے خوفناک دھارے کا رخ نہ پلٹ دیتی تو وہ بڑا ہو کر خونی اور ڈاکو کے سوا اور کچھ نہ بن سکتا۔ لیکن ان تین سالوں کی صحبت میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا اول تو یہ کہ مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ سب انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں، اور یہ کہ ساگرہ گاؤں سے باہر جس طرح کی دو طرفیں ہیں، ایک اور دنیا آباد ہے، جس کی چار طرفیں ہیں، شمال، مشرق، جنوب مغرب زمین گول ہے اور ساگرہ کے لوگ کنوئیں کے مینڈک ہیں حاکم لوگ اس لیے حکومت کرتے ہیں کہ لوگ جاہل اور بے خبر ہوتے ہیں علم زندگی کا زیور ہے اور سرکار انگریزی کی برکتیں ہندوستان پر اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ نہ تو وہ گنی جا سکتی ہیں، اور نہ ہی ہندوستان کے لوگ کبھی ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں گلاب ذہین تھا اور پڑھنے کا شوق رکھتا تھا اس لیے جلد ہی وہ یہ سب کچھ سیکھ گیا اور ران پر اپنا اعتقاد لے آیا۔

تین سال کے قلیل عرصے میں اس نے پانچویں تک تعلیم حاصل کر لی، اور

جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو عبداللہ نے اسے بھی امتحان میں شریک کرلیا جہاں وہ سب لڑکوں سے اول رہا بتول کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور ماسٹر عبداللہ نے بھی اسے شاباش دی یہ ٹھیک ہے کہ اسے دن بھر اسکول کے کام سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ وہ گلاب کو تعلیم دے سکتا پھر بھی اسے بتول کی خاطر گلاب سے بہت ہمدردی تھی، مگر جب بھی اس کے پاس کچھ وقت ہوتا اور گلاب حاضر ہوتا تو وہ ضرور اسے کام کی باتیں بتاتا لیکن اس کے پاس وقت ہی بہت کم بچتا تھا اول تو وہ ادیب فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو سکے اور وہ کسی مڈل اسکول میں لگایا جائے جہاں وہ بتول کے لیے سونے کے گہنے بنوا سکتا پھر اسکول کے لڑکے بہت شرارتی اور آوارہ مزاج تھے، وہ جم کر ایک جگہ کام نہ کر سکتے تھے۔ وہ جنگلوں میں آزاد پھرنا چاہتے تھے اور یہاں انہیں گھٹنوں گھٹنوں کے بل اکڑوں ہو کر قاعدہ یاد کرنا پڑتا تھا انہیں خوش رکھنے کے عبداللہ کو اسکول میں بہت سی چھٹیاں دینی پڑتیں یا اگر چھٹی نہ دیتا تو لڑکے یہ کہتے ہوئے

ڈھاکے کے پکے آخری
مسیتی کم کے
ملاہو، مری گئے
ملانی سر کھے

اسکول سے رفو چکر ہو جاتے اور سیٹیاں بجاتے، گھاٹیوں کے مرغزاروں میں آخرے چن چن کر کھاتے۔ ان چھٹیوں کے علاوہ لڑکوں کے والدین علیحدہ چھٹیاں تجویز کرتے۔

''ماسٹر جی آج میری لڑکی بیمار ہے، ذرا ننھے کو چھٹی دے دیجئے، ریوڑ کو جنگل لے جائے گا۔''

''ماسٹر جی دھان کی پنیری تیار ہے لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے''

''ماسٹر جی گھاس پیلی ہوگئی ہے، لڑکوں کی ضرورت ہے''

''لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے''

اور عبداللہ کو چھٹیاں دینی پڑتیں، اور لڑکوں کے والدین بھی اسے خوش کر دیتے تھے مکھن، چاول، مکئی اور پھل، لکڑیاں مرغی، انڈے ماسٹر جی کی نذر ہوتے رہتے۔ اور اگر کوئی لڑکا نذر نہ دیتا تو خود ہی مانگ لیتے سرکار بیوقوف نہیں تھی، جو انہیں دس روپے ماہانہ تنخواہ دیتی تھی اس کا مطلب یہ تھا یہ لو دس روپے ماہانہ مجھے پتہ ہے کہ ان دس روپوں میں تمہارا کام نہیں چل سکتا لیکن آخر یہ کسان لوگ کس مرض کی دوا ہیں علم زندگی کا زیور ہے اور جن لوگوں کو تم زندگی کا زیور عطا کرتے ہو، کیا ان سے تمہیں معمولی چیزیں مانگنے میں شرم آتی ہے؟

۔۔۔۔عمر بٹ صاحب۔۔۔ کرشن چندر۔۔۔صفحہ نمبر 401 سے

20-09-2007۔۔۔

لیکن عبداللہ کو سچ مچ یہ چیزیں مانگتے ہوئے شرم آتی تھی اور بتول تو بہت کڑھتی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا کہ دس روپوں میں گزارہ نہیں ہو سکتا اور موجودہ زندگی کے چلتے ہوئے تیز دھارے پر پیٹ اور ایمان دونوں ایک ہی طاقت میں سلامت نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے تو وہ مکھن اور چاول قبول کرنے لگے تھے، اور اب ایسا معلوم ہوتا کہ گو علم زندگی کا زیور ہے۔

لیکن کسان .... زندگی کا منبع ہے، اور یہ منبع ہر روز سوکھتا جا رہا تھا۔ گویا انسانیت اپنے ہاتھوں خودکشی کر رہی تھی۔ عبداللہ نے سوچا کہ جب ادیب فاضل پاس کرے گا اور کسی مڈل اسکول میں، کسی اچھے مڈل اسکول میں، اچھے معاوضے پر تعینات ہو جائے گا۔ تو کبھی کسان سے نذر قبول نہیں کرے گا۔

آخر بتول کی دعائیں رنگ لائیں اور عبداللہ نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کرلیا جب وہ ادیب فاضل کا امتحان دینے کے لیے سری نگر روانہ ہوا تو اس نے گلاب سے بتول کی خبر گیری کے لیے کہا اور گلاب نے ایسی جاں فشانی سے بتول کے کام کیے، کپڑے دھوئے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا، راتوں کو اسکول کے آنگن میں سویا، غرض کہ ست نارائن نمبردار اور دیگر بوڑھے برہمنوں کو پورا یقین ہو گیا کہ اسکول ماسٹر نے گلاب کو مسلمان کرلیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسی سلسلے میں ایک عرضی بنام سرکار داغ دی، کہ یہاں کا ماسٹر ہمارا دھرم گنوانے پر تلا ہوا ہے۔ سرکاری محکمہ میں جب یہ عرضی گھومتی گھومتی آخری حاکم اعلیٰ کے پاس گئی تو اس وقت عبداللہ ادیب فاضل کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اسے ترقی دے کر ایک مڈل اسکول میں تعینات کیا گیا۔ ساگرہ کے گاؤں سے اس کی تبدیلی ہوگئی اور اس طرح گاؤں والوں کے آنسو بھی پونچھ دیئے گئے۔

بتول کے جانے کے بعد گلاب چند دن ہی ساگرہ میں رہا۔ اب اس کا دل ساگرہ کے کنوئیں سے بھر گیا تھا۔ وہ صدیوں کی جڑیں اکھڑ چکی تھیں۔ چلتے وقت بتول نے اپنے ہاتھوں سے اس کے رخساروں کے آنسو پونچھے تھے، اور آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو پڑی تھی۔ عبداللہ نے گلاب کو سری نگر میں ایک ہیڈ ماسٹر

کے نام چھٹی دی تھی اور کہا تھا کہ اگر وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہے گا تو وہ ہیڈ ماسٹر اسے دسویں تک تعلیم دلانے میں بہت مدد دے گا۔

چنانچہ ایک دن ست نرائن نمبردار نے گلاب کو غائب پایا۔مویشی خانے میں ڈنگر چلا رہے تھے۔ دن چڑھے تک انھیں کسی نے نہ کھولا تھا نہ پانی پلایا تھا.........نمبردار نے دیکھا کہ گلاب کی چارپائی خالی ہے۔چارپائی پر اس کا پھٹا ہوا کمبل پڑا تھا اور گلاب کی بنسری، اور ایک کاغذ کے ورق پر لکھا تھا۔''میں جارہا ہوں، پھر کبھی نہ آؤں گا۔میری بنسری درگا کو دے دی جائے۔گلاب رائے۔''

درگا کے باپ نے بنسری کو ایک چٹان پر ریزہ ریزہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حرامی، میری معصوم بیٹی کو ورغلانا چاہتا تھا۔''

اور ست نرائن نمبردار نے شام کو شیو جی کے گرد پرکرما لیتے ہوئے پرماتما کا شکریہ ادا کیا جس نے آج اس کی دولت میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا۔

گلاب کو ساگرہ سے سری نگر پہنچنے میں قریباً ایک مہینہ لگ گیا۔اول تو اسے راستہ ہی معلوم نہ تھا اور پھر اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی کہ وہ راستے میں دیگر مسافروں کی طرح سامان خورونوش خرید سکتا، اس کے پاس ایک ہی قمیض تھی، اور ایک اونی فرغل، پاؤں میں دھان کی پولیں اور ہاتھ میں کاؤ کی ایک ٹیڑھی اور مضبوط لکڑی، لیکن دل میں عزم راسخ تھا اور اپنی زندگی کی شکست کو فتح میں مبدل کرنا چاہتا تھا، پانچویں جماعت میں اول رہنے پر اس کی انانیت چمک اٹھی تھی، سویا ہوا شخصی غرور بیدار ہو گیا تھا اور اس کے سامنے عبداللہ کی مثال تھی، جو اس کی طرح ایک کسان کا بیٹا تھا۔اور جس نے پہلے دسویں اور اب ادیب فاضل بھی پاس

کرلیا تھا۔ پہلے دن اس نے وہی مکئی کی باسی روٹی اور کڑم کا ساگ کھایا جو وہ ساگرہ سے لایا تھا اور دوسرے دن جب راہ چلتے چلتے اسے بہت بھوک لگی، تو وہ راستہ سے اتر کر ایک گاؤں میں اتر گیا، راستے میں اسے ہر گاؤں ساگرہ نظر آتا تھا، اتنا فرق ضرور تھا کہ وادی کہیں کشادہ ہوتی تھی اور کہیں تنگ، لوگوں کے لباس بھی ایک ہی طرح کے تھے اور طرز گفتگو بھی وہی، لیکن یہ سب گاؤں مسلمانوں کے تھے، کہیں اکا دکا اسے برہمنوں کا گاؤں مل جاتا۔ یا کسی مہاجن کا گھر، پہلے تو اس نے مسلمانوں کے گھروں سے روٹی مانگنے سے احتراز کیا اور اکثر کسان لوگ اسے خود ہی کسی اکے دکے برہمن، سکھ یا مہاجن کا گھر بتا دیتے۔ اکثر گاؤں میں ایک آدھ مہاجن ضرور ہوتا تھا۔ اس کا گھر باقی گھروں سے ہمیشہ کشادہ اور صاف ہوتا۔ یہ مہاجن عموماً علاقہ پوٹھوہار پنجاب سے آئے ہوئے ہوتے، ان کا گاؤں میں رعب تھا۔ کسان انھیں شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے اور سچ مچ گاؤں کا شاہ بلکہ بادشاہ تھا۔ پٹواری اور فارسٹ کے راکھے اور فارسٹروں کی آنکھیں بھی اس کے آگے جھکتی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار سے لے کر گاؤں کے کمین تک ہر ایک شخص پر اس کا قرض دار اور احسان مند تھا۔ مہاجرین گاؤں کا امدادی بنک تھا۔ مہاجن گاؤں کا بزاز تھا، مہاجن گاؤں کا حکیم تھا اور مہاجن گاؤں کا بنیا اور اکثر اوقات پنچ بھی۔ کسان لوگوں کا بال بال اس کے قابو میں تھا، اور پھر بھی کسان لوگوں کے بال بال سے اس کے لیے دعائیں نکلتی تھیں اور وہ یہ حقیقت میں سمجھتے تھے کہ اگر گاؤں میں شاہ نہ ہو تو بھوکوں مر جائیں.......... پٹواری اور تحصیلدار کے بغیر گزارہ ہوسکتا تھا۔ لیکن شاہ کے بغیر نہیں۔ تحصیل دار مشیر مال، محاصلات کا افسر اور جنگلات کا بڑا

بابو ہر ایک سرکاری کارندہ شاہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا اور یہ تو ایک باہمی سمجھوتے کی بات تھی، کہ جب سرکاری کارندے گاشی میں سرکاری کام پر آتے تو ہمیشہ شاہ جی کے مکان پر ٹھہرتے، اور شاہ جی خوب ان کی خاطر تواضع کرتے، اور جب شاہ جی اپنے مقدمات کے سلسلے میں تحصیل دار یا نائب تحصیل دار کی عدالت میں جاتے، تو کچہری کا ہر فرد ان سے ادب و احترام سے پیش آتا۔ انھیں بید کی کرسی پر بٹھایا جاتا، عمدہ سگریٹ پیش کیا جاتا، اور شاہ جی دبی زبان سے کہتے:

''دیکھنا منشی جی! تاریخ ذرا نزدیک رکھنا، اگلی پیشی کی تاریخ کہیں دور نہ رکھ دینا۔ مقدمے کا فیصلہ جلد ہو جائے۔'' منشی مسکرا کر کہتا ''بھلا شاہ جی کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات رد کر دی جائے آپ کون سی تاریخ چاہتے ہیں؟ اگلے مہینے کی پندرہ؟ اچھی بات یہی سہی ایک ہفتہ ادھر کیا، ایک ہفتہ ادھر کیا، ایک ہی بات تو ہے۔'' اور تحصیل دار صاحب کہتے۔ ''ہاں ہاں، بھادوں ہی ٹھیک ہے اس وقت ہم بھی دوروں سے واپس آ گئے ہوں گے؟''

لیکن گلاب نے معلوم کیا کہ اکثر شاہ بہت مہمان نواز تھے اور برہمنوں پر تو وہ اکثر بہت مہربانی کرتے تھے، اور جب انھیں پتہ چل جاتا کہ گلاب برہمن ہے اور تحصیل علم کے لیے سری نگر جا رہا ہے، تو وہ بہت خوش ہوتے، اسے اچھی روٹی کھلاتے اور چلتے وقت ایک دونی بھی برہمن دیوتا کی نذر کر دیتے، موضع نکا کے شاہ جی اس کی اولوالعزمی پر بہت محظوظ ہوئے، کہنے لگے، ''شاباش، بیٹا شاباش میں تمہاری جرأت پر بہت خوش ہوں، میں بھی تمہاری عمر سے نکل بھاگا تھا۔ ہم چکوال میں رہتے تھے، میرے ماں باپ بہت غریب تھے اور میرا باپ گدھوں پر

اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے۔ پھر ایک دن میں لڑ کر گھر سے بھاگ آیا اور یہاں چلا آیا۔ بہت دیر ادھر ادھر گھومتا رہا اور آخر ایک ساہوکار نے مجھے بتایا کہ موضع نکا بیوپار کے لیے بہت اچھی جگہ ہو گی۔ وہاں ابھی تک کوئی شاہ نہیں بیٹھا، اس نے مجھے نسوار کا ٹین اور نمک اور چند ایک اور ضروری اشیاء ادھار دیں۔ نمبر دار نے یہ دکان مجھے عاریتاً دی اور آج دیکھو کہ اپنی محنت اور مشقت کے بعد میں اس گاؤں کا شاہ ہوں۔ آس پاس کے علاقے میں میرا بیج و بیوپار پھیلا ہوا ہے۔ کم و بیش چالیس پچاس ہزار روپیہ میں نے باہر ڈیوڑھے پر دے رکھا ہے۔ ہر جگہ میری عزت ہے۔ شادی بھی میں نے کی ہے، تین بچے ہیں۔ اب میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ میرا بڑا لڑکا موتی رام تمہاری عمر کا ہو گا۔ یہی اب دکان کا کام چلاتا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ باقی دو لڑکے بھی بڑے ہو جائیں تو انھیں بھی علاقے میں بیج و بیوپار پر لگا دوں تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بیٹا اولوالعزمی بڑی چیز ہے۔ اگر آج میں چکوال میں بیٹھا رہتا تو گدھے لادتا جنگلوں کی خاک چھانتا............شاید کبھی کسی درندے کا شکار ہو جاتا۔ اب تو میرے پاس لائسنس بھی ہے۔ اے موتی رام بیٹا! میں ذرا پٹواری کے گھر ہو آؤں۔ ان برہمن دیوتا کا خیال رکھنا۔ اور انہیں کوہی تکلیف نہ ہونے دینا۔ بھوجن وغیرہ اچھی طرح کھلانا۔ اچھا رام رام بھیا............خوب پڑھو، کبھی اس علاقے میں تحصیلدار بن کر آؤ تو اس غریب شاہ کو بھی یاد رکھنا۔''

گلاب غور سے موتی رام کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہ کا لڑکا چالیس پچاس ہزار کا مالک، یہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا۔ موتی رام دبلا پتلا سا لڑکا تھا۔ بس اس کا ہم عمر ہو

گا۔ یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال، رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئیں۔ لیکن رخساروں پر سرخی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکتی ہوئی، یہ لڑکا چالیس پچاس ہزار روپے کا مالک۔ رام رے، اتنے روپے، اس نے آج تک کبھی ایک روپیہ بھی کہیں سے نہ پایا تھا۔ یہ بنج بیوپار بھی خوب چیز ہے اور عبداللہ کی زندگی کس قدر مختلف اور اروفع، عبداللہ کا کارنامہ اسے بالکل ہیچ معلوم ہونے لگا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دکان پر ایک نوجوان عورت آئی۔ موتی رام اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگا

''سلام چھوٹے شاہ جی۔''

''سلام نورشیان، بڑی مدت کے بعد آئی ہو، شادی جو تھی تمہاری، مبارک ہو۔''

''تمہیں مبارک ہو چھوٹے شاہ جی،'' نورشیان نے شرما کر کہا اور اس کے رخسار گلابی ہو گئے۔ نورشیاں نے رنگین اور پھولدار سوسی کی بھاری شلوار پہن رکھی تھی اور اسی کپڑے کی قمیض بھی۔ سر پر سرخ چادر تھی اور چوٹی کے آخر میں نقلی موتیوں کی سبز سبز لڑیاں گندھی ہوئی تھیں، جو اس کے کندھوں یا گردن کے ایک خفیف سی حرکت سے وجد میں آ جاتی تھیں اور ایک روپہلا نغمہ پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے چھلے تھے اور ایک گلٹ کی سنہری انگوٹھی، کانوں میں چاندی کی بالیاں اور ناک میں سنہری لونگ۔ گو اس کا قد موتی رام سے بھی لمبا تھا۔ لیکن اب وہ وہاں چوکھٹ کے ساتھ اس طرح لگ کر کھڑی تھی، کہ بالکل ایک کھلونا سی معلوم ہوتی تھی، موتی رام اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تارے کی طرح چمکنے لگیں، اور اس کے موٹے ہونٹ لعاب

سے گیلے ہو گئے۔ وہ کچھ کہنے کو تھا لیکن گلاب کو پرے بیٹھا دیکھ کر رک گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا ''اور........ تمہاری سہیلی سیداں کہاں ہے۔ کیا اس کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ مدت سے اسے دیکھا نہیں۔ اس مہینہ تو وہ دکان پر نہیں آئی۔ کیا ہم سے کوئی خفگی ہے۔''

نورنشیان زیر لب ہنسی، پھر بولی۔ ''نہیں چھوٹے شاہ جی! وہ اپنی خالہ کے ہاں گئی ہے۔''

موتی رام نے کہا۔ ''تمہاری شادی بھی ہو گئی اور تم نے ہمارا منہ میٹھا بھی نہ کرایا۔ اکبرا کہاں ہے؟''

''وہ پار (پنجاب) گئے ہیں۔ خالو کے لڑکے کا خط آیا تھا کہ کسی باورچی خانے میں ایک جگہ خالی ہونے والی ہے..........''

''اچھا۔ اچھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔''

نورنشیاں قدرے توقف کے بعد بولی۔ مجھے تھوڑا سا گڑ چاہیے اور چھوارے۔

موتی رام نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ نورنشیان کے کندھے پر رکھ دیا۔ آہستہ سے۔ اور بظاہر بالکل لاپروائی نورنشیان پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح جھک گئی۔ بولا ''خوب گڑ اور چھوارے بھی ہم ہی دیں اور تمہاری شادی ہوئی تم نے ہمارا منہ میٹھا بھی نہ کرایا۔''

کیوں جی۔

نورنشیان نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں کیسے منہ میٹھا کراؤں؟''

موتی رام نے اس کے کندھے سے ہاتھ اٹھالیا اور آہستہ سے بولا۔ ''اچھا جو چاہیے لے لو، اس طرف اندر آ جاؤ اور اپنی پسند کی چیز لے لو۔ ادھر سب اچھی چیزیں پڑی ہیں، نیا پشاوری گڑ آیا ہے۔ شہد کی طرح میٹھا، تازہ چھوارے اور دودھ کی طرح سفید ناریل اور سونف کے مکھانے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مکھانے۔ آؤ۔''

دیر تک نور ششیان چوکھٹ سے لگی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ موتی رام نے اپنی کانپتی انگلیوں سے اس کے بازو کو پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر دکان کے اندر ایک گودام کی طرف لے جانے لگا۔ سبز سبز نقلی موتیوں کی لڑیوں سے ایک جھنکار سی پیدا ہوئی اور گلاب کو معلوم ہوا جیسے وہ کوئی نوحہ پڑھ رہی ہو، اور اس کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد نور ششیان دکان سے باہر آئی، اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھی۔ گال تمتمائے ہوئے اور سرخ چادر کی جھولی میں چھوارے اور ناریل اور مکھانے بھرے ہوئے تھے۔

پیاسا

نواب بڑا اتر یلا اور زنخا سا لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لیے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر رو دھو کر صبر کر لیتا تھا، دوسرے لوگوں کی طرح بوریا بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور وہ بہت دبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا جو وہ کھاتا تھا وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کسی دیوار یا کسی دروازے سے لگ کر نیم دراو حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسیٹ رہے ہیں سر بائیں طرف لٹکا ہوا ہے تو کولھا دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ماتھے پر ہے تو دوسرے سے پیٹھ کھجا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے کا شوق تھا۔ انہیں کی طرح وہ فقرے چبا چبا کر چپٹا کر کے یا ربڑ کی طرح کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا، اس لیے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور غمزدوں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ اسے صرف اوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لیے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا باورچی کو کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو تین دن اور کچن میں بینگن بگھارنا پڑے اور لہسن کی چٹنی پیس کر کھڑے مسالے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہوگئی، مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بول پڑا۔ ''صاحب ہم سے نہیں ہوتا۔ ہم کو ایک دن کی چھٹی دو، ہم آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔''

''کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟'' زرینہ نے اس کی جھنجلاہٹ پر مسکرا کر پوچھا۔

کچن سے باہر آ کر نواب کو جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر ابھرنے لگی۔ اس پر اسے گھر کی مالکن کی مسکراہٹ جو ملی اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اچکایا اور دوسرا نیچے کیا بایاں کولھا اندر کی طرف جھکایا، دایاں کولھا ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ ادا سے ملتے ہوئے بولے۔ ''اب لائیں گے، کہیں نہ کہیں سے آپ کے لیے باورچی!''

نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کا مسئلہ ایک پر اسرار سیاسی راز کی طرح ہمارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہوگیا۔ جی چاہا سالے کو دوں دو جھانپڑ اور اس کی ساری اتراہٹ نکال دوں مگر ضرورت باورچی کی تھی۔ اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو، اس لیے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینی پڑی۔

ایک دن بعد اتوار تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیزار بیٹھا ہوا ملگجی صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا سر ٹوتھ پیسٹ

کے ٹیوب کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جب تک دباؤ نہیں کچھ نکلتا نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازے کی پٹی تھامے گردن ایک طرف لٹکائے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ''میں۔ میں.........وہ ہنس پڑے.........ہم باورچی لے آئے۔''

''کدھر ہے؟'' میں ڈپٹ کر پوچھا۔

نواب خائف ہو کر ذرا سیدھے ہوئے اپنے دونوں بازو دروازے کی پٹی سے اتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے، پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کسی اور کو راستہ دے کر بولے۔ ''اندر چلے آؤ۔''

کالا دبلا پتلا کرنجی آنکھوں والا آدمی اندر آیا، عمر کوئی پچیس برس کی ہو گی، چھوٹے چھوٹے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، تنگ ماتھا، بال الجھے ہوئے، گال اندر کو دھنسے ہوئے، دانتوں کی ریخوں میں پان کا بھورا میل نمایاں، شیو کے باوجود ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال رہ گئے تھے، عجب کراہت سی محسوس ہوئی۔

''تم باورچی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''اوم پرکاش۔''

میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر نواب سے کہا۔ ''اسے بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ۔ وہ دیکھ لیں اور چاہیں تو رکھ لیں۔''

دوپہر کے کھانے میں شاہجہانی قورمہ اور شملہ مرچ میں بھرا ہوا قیمہ تھا اور دم

کیے ہوئے آلو تھے، مٹر پلاؤ اور انتہ اور دو طرح کا میٹھا شاہی ٹکڑے اور دودھی حلوہ، ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی۔ صحیح ذائقے والی میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''اوم پر کاش کھانا تم ٹھیک پکا لیتے ہو۔''

''اوم پر کاش!'' زرینہ میری طرف دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ''مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے۔''

میں نے باورچی کی طرف دیکھا، جو ایک کونے میں دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھے کھڑا تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

''کیوں بے۔'' تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟ میں نے باورچی سے پوچھا۔

بولا۔ ''صاحب آپ کے کمرے میں آیا اور آپ کو دیکھا تو ایسا لگا کہ شاید آپ ہندو ہیں تو میں نے آپ کو اپنا نام اوم پر کاش بتایا، پھر میں بیگم صاحب کے کمرے میں گیا تو مجھ کو ایسا لگا جیسے وہ مسلمان ہیں تو میں نے اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔''

''مگر بے وقوف، تم ایک کمرے میں اوم پر کاش اور دوسرے میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟''

''دلی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب ایک گھر میں اوم پر کاش اور دوسرے گھر میں اشتیاق بننا پڑتا ہے.......... پیٹ روٹی مانگتا ہے صاحب! اس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا، اور اس کے لہجے سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے شکایت اس امر کی نہیں ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس کی بات کی ہے کہ پیٹ

روٹی کیوں مانگتا ہے؟''

گرمیوں کے دن تھے دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا، تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لیے باتھ روم میں جا گھسا، ٹونٹی گھما کر معلوم کیا کہ شاور خراب ہو چکا ہے۔ نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے تلوؤں میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق بھاگا بھاگا آیا، میں اس سے کہا ''چوک میں جا کر منشی پلمبر کو بلاؤ شاور خراب ہے۔''

''میں ٹھیک کیے دیتا ہوں۔'' اشتیاق بولا۔

''تم۔''

وہ سر جھکا کر عاجزی سے بولا، ''جی میں پلمنگ کا کام بھی جانتا ہوں؟''

پانچ منٹ میں اس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

شام کو بجلی کا پیڈسٹل فین جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ زرینہ نے نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی دوپہر کی نیند سے فارغ نہیں ہوا ہے۔ لہذا اشتیاق کو بلایا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ چوک میں پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے سامنے پنکھا درست کرا کے لائے، بہت گرمی ہے آج تو رات بھر صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق نے گہرے تجسس سے پنکھے کا معائنہ کیا، معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں بازو اپنی ناف پر رکھ لیے۔ بولا۔ ''حضور میں پنکھا ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

''کیا تم پنکھے کا کام جانتے ہو۔'' میں نے اس سے پوچھا۔

سر جھکا کر بولا۔ ''جی بجلی کا کام بھی جانتا ہوں، پنکھا فٹ کر لیتا ہوں۔ ابھی کر

کے دکھاتا ہوں۔''

ڈیڑھ گھنٹے میں پیڈسٹل فین فرفر چلنے لگا۔ میں نے اشتیاق کو نئی نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ مسکرایا۔ آخر میں سکڑ کر کچھ سمٹ کر کچھ دبک کہ کچن میں چلا گیا۔

رات کے کھانے میں رام پوری چکن تھا۔ چکن کاٹو تو اندر بریانی ملتی ہے۔ بریانی ہٹاؤ تو اندر چکن چاٹ نظر آتی ہے۔ چکن چاٹ کھالو تو اندر رانڈوں کا خاگینہ ملتا ہے اور بادام اور کشمش کے ساتھ عجیب بھول بھلیاں قسم کی ڈش تھی مگر ستھری اور مزے دار میں ایک روپیہ انعام دیا تو جھک کر سات بار کورنش بجالائے بولے۔''آپ نے انعام دیا ہے، یہ ہے بندر پر اکرام!''

''ارے''میرے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں''سر جھکا کر بولے۔''میں شاعر بھی ہوں میرا تخلص تنہائی ہے۔''

میری طبیعت شاعروں سے بہت الجھتی ہے۔ سنا ہے ہر وقت پان کھاتے رہتے ہیں اور شعر اگلتے رہتے ہین۔ پہلے جی چاہا آج ہی جواب دے دوں۔ پھر اگلے بیس روز میں معلوم ہوا کہ حضرت بیس بائیس دوسرے پیشے بھی جانتے ہیں، کرسیاں بن لیتے ہیں، مونڈھے ٹھیک کر لیتے ہیں۔ کیونکہ بڑھئی کا کام بھی سیکھا ہے۔ سینما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں۔ گنڈیریاں بیچی ہیں۔ پنواڑی کے ہاں کام کیا ہے۔ ٹھیلا کھینچا ہے۔ کھلونوں کی فیکٹری میں کام کیا ہے۔ حجام یہ رہ چکے ہیں، سلائی سے لے کر دھلائی تک کے سب مراحل یہ پیشہ ور کی حیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ بڑے عمدہ مالشیے ہیں، سر کی تمپی کے استاد ہیں کن میلیے بھی ہیں اور چاٹ بنانا بھی جانتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ انتہائی کم خوراک ہیں۔

زرینہ کو ان کی عادت بہت بھا گئی ہے کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی ہے۔
اس لیے اس نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا سکہ سارے گھر میں جم گیا اس طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی نا اہل اور ناکارہ ہوتا گیا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی یہی کچھ چاہتا ہے عمر میں نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ سال چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں نواب اشتیاق سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ مالک ہو اور اشتیاق اس کا غلام ہو، پہلے تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ جذبہ احسان مندی میں ہو رہا ہے۔ بعد میں خیال آیا ممکن ہے اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کی بات ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ عاشق کی آنکھوں کی بینائی بہت کمزور ہو جس کی ساعت تقریباً نہ ہو اور کوئی لطیف جذبہ دل میں نہ ہو، بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال صحیح نہ تھا اشتیاق نہ نواب کو اپنا محسن سمجھتا تھا اور نہ اس پر فریفتہ تھا بس اسے دوسروں کو کھلانے کا مرض تھا۔ اور دوسروں کو کھلا پلا کر دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتا تھا۔ چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لیے وہ اپنے حصے کی خوراک بھی نواب کو منتقل کر دیتا، ہمارے بعد اس کے لیے سالن کا بہترین حصہ مخصوص کر دیتا۔ پہلے اسے کھلاتا اور پھر خود کھاتا۔ ہولے ہولے نواب نے دل چسپی لینا بالکل ختم کر دی کسی بڑی بلی کی طرح ایک کھٹیا پر آ کر پڑا رہتا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق اس کی فرضی بیماری بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں بڑا مزا لیتا اور اسے کھٹیا پر مستقل آرام کرنے کا مشورہ دیتا اس کے لیے بازار سے دوا لاتا اور پھل سگریٹ اور بیڑی کے پیسے بھی خود دیتا، کبھی کبھی ایک آدھ بش شرٹ اور پاجامہ

پتلون بھی سلا دیتا۔ ہولے ہولے اشتیاق کی تنخواہ کا بیشتر حصہ نواب پر خرچ ہونے لگا۔ اور نواب اپنی تنخواہ کی کل رقم بچا کر اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

زرینہ کے کئی بار اشتیاق کو سمجھایا اسے پائی پائی تنخواہ جمع کرنے کے فائدے سمجھائے مگر اشتیاق پر اس کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔

''بیگم صاحبہ بچہ ہے، کھا لیتا ہے تو کیا کرتا ہے۔''

''ارے تم اپنے لیے بھی کچھ کر لے کم بخت۔'' زرینہ چڑ کر اس سے کہتی ''دوسروں کے لیے کیوں مرتا ہے۔''

''میرا آگے پیچھے کون ہے بیگم صاحب۔'' اشتیاق گردن جھکا کر جواب دیتا۔ ''بھائی نہیں، بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں سب بھرت پور کے فسادوں میں مارے گئے، میرا سینہ خالی خالی سا رہتا ہے۔''

کچھ دنوں بعد نواب کی ماں کا خط علی گڑھ سے آیا اس نے نواب کے لیے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی، دو ماہ بعد شادی تھی ماں اسے بلا رہی تھی، غفور سائیکل والا جس کے ہاں دہلی سے آنے سے پہلے نواب کام کرتا تھا وہ اب پھر اسے کام دینے پر تیار تھا۔ اس لیے نواب واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا۔ ورنہ سارا کام اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے گی۔ اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے کی ضرورت نہیں تھی۔

زرینہ بولی۔ ''نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کر لیے۔ اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی، مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔''

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا اس کی بھنویں تن گئیں، تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈولنے لگیں اور اس کے چھوٹے سے ہونٹ پھڑ کنے لگے، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب کے چہرے پر ایک عجیب سے مسکراہٹ آئی، کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا ارے صاحب یہ کیا شادی کرے گا، اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔

''کیوں؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''معلوم نہیں بیگم صاحب! یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔''

چند منٹ بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کر صحن میں ہاتھ دھونے کے لیے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے سے بھیگ کر تاراسی چمک رہی تھیں، مجھے اشتیاق میں دل چسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز بعد نواب نے علی گڑھ جانے کا پروگرام بنایا، اس کے جانے پر اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے۔ مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا، اس نے نواب کے لیے سفری ناشتہ تیار کرلیا، حالانکہ صرف ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار اور آلو کا بھرتا اور بیسنی روٹی اور مکھن کی ایک گولی وہ نواب کی بھوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس لیے ہم شکایت بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ خود نواب کے لیے اسکوٹر لے آیا، اس کا سامان

اسکوٹر پر رکھا اور اسے پرانی دلی کے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

دو دن تک اس طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا، جیسے اس کا گھر لٹ گیا ہو، وہ کسی اجاڑ ویرانے میں گھوم رہا ہو۔ کھانے کا معیار ایک دم گر گیا تھا، قورمہ اس کے جذبے کی طرح تلخ تھا، اور قلیہ اتنا پتلا جیسے کسی نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہو، چپاتیاں بے ڈول اور بے ہنگی اور ان پر جگہ جگہ مایوسی کی راکھ لگی ہوئی، دو دن تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا اور یہ سوچ لیا کہ اگر معاملہ یوں ہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن بعد اشتیاق سنبھل گیا، کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھا لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا اور اپنی تنخواہ کا کافی حصہ بلی کے لیے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دیکھا جائے تو بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں تھا اور اس کے عشوے اور نخرے بھی نواب سے کم نہ تھے اور اتنا ہی اتریلا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا اور دو ہی دن میں اشتیاق سنبھل گیا اور کھانے کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصل حالت پر آ گیا اور ہم لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو ناں نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا یہ کسی شیخی خورے کی عادت نہ تھی اس قدر جس قدر احساس کہ مجھے یہ کام کر کے دکھا دینا چاہیے اسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور عجیب سی لگن تھی اس کے دل میں جو اسے ہر کام پورا کرنے کے لیے اکساتی تھی۔ چاہے وہ اسے جانتا

ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور چونکہ میں ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہوں، اس لیے زرینہ نے مجھے کئی بار ریڈیو ٹھیک کرنے کے لیے کہا مگر دفتر کی طویل جھک جھک کے بعد ذہن اور جسم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کو کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں یہ کام آج اور کل پر ٹالتا رہا تھا۔

ایک دن میں دفتر سے جو آیا تو دیکھا کہ ڈرائینگ روم کے ایک کونے میں پورا ریڈیو کھلا پڑا ہے اور اشتیاق گھبرائی ہوئی حالت میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور زرینہ قریب کھڑی ہوئی رونکھی ہو رہی ہے میں نے آنکھوں کے اشارے ہی اشارے میں پوچھا کیا بات ہے؟ زرینہ بولی، ''اشتیاق کہہ رہا تھا، میں ریڈیو ٹھیک کر لیتا ہوں اور تمہیں کئی دن سے فرصت نہیں مل رہی ہے اس لیے میں نے اشتیاق کو کام پر لگا دیا۔ دو ڈھائی گھنٹے سے یہ کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ معمولی سا نقص ہے۔''

میں معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا، اشتیاق اپنے چھوٹے سے ماتھے پر بال گرائے مجھ سے آنکھیں چرائے ریڈیو پر کام کر رہے تھے، صاف معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو کھول تو لیا ہے مگر اب جوڑنا نہیں آتا۔ چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں نے زرینہ کو باہر بھیج دیا اور خود اشتیاق کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر میں نے اشتیاق کو بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اسے یہ کام کرنا نہیں آتا، بلکہ میں نے اس طریقے پر کام آگے بڑھایا جیسے ہر کام اشتیاق کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ گھنٹے بھر میں ریڈیو ٹھیک ہو گیا۔ زرینہ بہت خوش ہوئی اس نے

اشتیاق کو دو روپے انعام دیا۔ مگر چند دنوں بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی، زرینہ نے کہیں اس سے پوچھا۔ ''کیا تم رس گلے بنا سکتے ہو؟''

''جی ہاں۔'' اشتیاق فوراً بولے۔

''ایک دن بنا کے دکھاؤ۔''

''آج رات ہی کو بناؤں گا۔''

رات کے کھانے کے بعد دیر تک اشتیاق کچن میں کچھ کھڑ پڑ کرتا رہا۔ انگیٹھی سے دیر تک دھواں سلگتا رہا، منہ میں بیڑی جلتی رہی، ماتھے کے بال الجھتے رہے اور کچن کی زرد روشنی دیر تک صحن میں اپنا سر پٹکتی رہی، کوئی ایک بجے کے قریب کچن کی بتی بجھی اور اشتیاق نے دوسرے دن صبح کے ناشتے میں برف میں ٹھنڈے کیے گئے رس گلے تازہ اور عمدہ اور گلاب کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیش کیے۔ ''یہ رس گلے تم نے بنائے ہیں۔'' زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''جی اسی خاکسار نے۔'' اشتیاق دروازے سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہے۔'' زرینہ نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''یہی تو ان کی خوبی ہے۔'' میں نے کہا ''سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں۔''

''جی نہیں۔'' اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی ''تو آج رات

میرے سامنے رس گلے بناؤ، میں خود دیکھوں گی۔''

''جی بہت اچھا۔''

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں ایک فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی، دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار میں رہے، سرِ شام زرینہ نے ان کے جھولے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں، رات کو کھانے کے بعد اشتیاق نے بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر پندرہ بیس منٹ بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے، اشتیاق ایک تاب میں رس گلے لے کر آئے تھے، کھانڈ کے معطر شیرے میں فینائل کی گولیوں سے بھی دو تہائی حجم کی سفید سفید گولیاں تیر رہی تھیں، زرینہ چیخ، ارے یہ رس گلے ہیں، بکری کی مینگنی کے برابر؟

''ابھی چھوٹے ہیں، دیکھیے سمجھیے بیگم صاحب! اور یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرا پئیں گے، صبح تک پھول کر پورا رس گلا ہو جائیں گے۔'' اشتیاق نے سمجھایا۔

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لیے ہم سو گئے، صبح جب ناشتے پر پورے حجم کی بڑی گولائی کے سفید رس گلے کھانے کو ملے، کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو کونین کی گولیوں کے برابر حجم والے رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے تھے۔ مگر رات بھر کون جاگے اور کون چوکیداری کرے؟ اشتیاق ضرور صبح صبح بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی گولیاں انھوں نے نالی

میں بہادی ہوں گی، مگر اب کیا ہوسکتا ہے؟ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دوسروں کو رس گلے کھلا سکتا ہے۔ محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے، اس سے الجھنا بے کار ہے۔

جوں جوں بلی کا بچہ بڑا ہوتا گیا، اشتیاق کا جذب دروں بڑھتا گیا، چند ماہ میں ہمارے سامنے ایک خوب صورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی، جس کے بال مکھن کی طرح ملائم تھے جو انتہائی میٹھی سرگرمیوں میں خرخر کرتی تھی اور جب گردن نیوڑھا کر آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف دیکھتی تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا تھا۔ تھی بھی قیامت کی حرافہ، موٹی گل گوتھلی سی، کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی، کبھی ایک دم چنچل ہو کر چھلانگ لگاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کر بیٹھ جاتی اور خوب دھوپ کا مزہ لیتی، کبھی اس کی بانہوں میں پوری طرح پھیل کر بیٹھ جاتی، عورت کی پوری سپردگی کے ہر انداز میں، کبھی شریر تغافل، ادا سے ایک مست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق ایک عجیب مسرت اور حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا، مگر پیار کی اہمیت میں اسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن میری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم میں دستک دی۔ سردیوں کے دن آ چکے تھے، اس لیے زرینہ صبح ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گون میں ملبوس ایک سوئیٹر بن رہی تھی، کون ہے؟ زرینہ نے پوچھا۔

''میں ہوں اشتیاق۔''

''اندر آ جاؤ۔'' زرینہ بولی۔

کاغذ پینسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں

دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے چپکے سے ایک کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا۔ ’’لکھیے۔‘‘

زرینہ بولی۔ ’’کیا کل حساب ہے۔ ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔‘‘

’’حساب نہیں ہے۔‘‘

’’پھر کیا ہے؟‘‘

’’آپ لکھیے تو۔‘‘ اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہے تھے۔

’’آخر ہے کیا؟‘‘

’’ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں۔‘‘

زرینہ چند لمحوں کے لیے بھونچکی رہ گئی، پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی اور مسکرا کر بولی۔ ’’تم خود نہیں لکھ سکتے؟‘‘

’’جی نہیں میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔‘‘

’’مگر شعر کہہ سکتے ہو۔‘‘ زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

’’جی۔ جی بالکل کہہ سکتا ہوں، آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔‘‘ کہیے زرینہ نے زچ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے آنکھیں بند کر لیں، اور ایک عجیب محویت کے عالم میں بولا۔

’’تنہائی میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے مجھ سے جو ہو سو ہو۔‘‘

’’مگر اس کی بحر کیا ہے؟‘‘ زرینہ نے پوچھا۔

’’بحر؟‘‘ اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ ’’بہر حال غزل تو

غزل ہے۔''

''مگراس کا وزن۔'' زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

''بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب آپ لکھیے تو۔'' اشتیاق نے کامل دل جمی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی، ''بولی آگے چلیے۔'' اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے۔

''تیری جدائی میں ہوئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو''

زرینہ نے پوچھا۔'' کہتا ہے تنہائی! مگر تنہائی تو مونث ہے۔''

''مگر تنہائی میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں۔'' اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے کی ایسی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو۔

''اجی بیگم صاحب! یہ شعرو شاعری آپ کیا جانیں۔''

اور یہ مست فگار کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔ زرینہ نے پوچھا۔

''ہمارے مرادآباد میں ایسا ہی بولتے ہیں۔'' اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ اور پینسل بیڈروم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیئے گرج کر بولی۔ ''اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے مجھے اپنا کوئی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔'' اشتیاق نے کھسیا کر سر کھجانے لگے۔ بے حد محجوب اور شرمندہ سے دکھائی دے رہے ہیں۔ زرینہ کو اس پر رحم آ گیا نرم لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی، میرے خیال میں اگر آپ شعروشعاری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف

توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

فوراً سر اٹھا کر بولے۔ ''ایک ناول تیار کر رہا ہوں۔''

''کیا نام ہے اس ناول کا؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''لائف اینڈ کک۔'' اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کیا کرتے تھے۔ یا آج کے ان مزدوروں کی جوان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم مصدر کی محتاج نہیں مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس کی انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ ''تم اتنے سارے دھندے جانتے ہو، اگر تم کوئی ایک دھندا پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔''

''صاحب میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔'' اشتیاق ایک چھوٹے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''سال چھ ماہ ایک دھندا کیا پھر دوسرے میں چلا گیا۔ اسی طرح زندگی کے پینتیس چھتیس برس گزار دیئے ہیں باقی بھی گزر ہی جائے گی۔''

''تو تم ایک دھندے میں جی کیوں نہیں لگاتے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں لگتا۔'' اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کر بولا۔

''میرا سینہ ہروقت خالی خالی سا رہتا ہے۔''

''میاؤں۔'' دروازے پر گلو تشریف لائیں اور وہ منہ اٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اسے گود میں اٹھالیا اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''گلو بھوکی ہے اسے دودھ دے آؤں۔''

''جاؤ۔''

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے ہیں، جبکہ وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچن میں غائب بیٹھا رہتا تھا۔ جانے کیا سوچتا ہے، خود ہی مسکراتا ہے خود ہی گھورتا ہے، خود ہی سسکنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ کیا گزرتی ہے اس پر وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے کچھ بتاتا تو ہے نہیں کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے قیاس غالب ہے جب دل کی گھٹن اور سینے کا سونا پن حد سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ مہینے میں ایک یا دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا، سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں چارپائی پر پڑا رہتا ہے، اس کا سینہ دھونکتا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آجاتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ دن نہ بدلا ہے نہ تاریخ بدلی ہے۔ نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے، اور ہم بھی اس لیے چپ رہتے ہیں، یہ کام بہت اچھا کرتا ہے ماہر ہی نہیں آرٹسٹ بھی ہے ہر کام کا اور فن کاروں کے دماغ کی ایک چول ڈھیلی ہوتی ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔

اس لیے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اس سے کہا حیدر آبادی بینگن بنائے اور وہ

لے آئے، کچھ عجیب سی ڈش، جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس میں بینگن کے کالے کالے ٹکڑے مرے ہوئے چوہوں کی طرح تیر رہے تھے۔

''یہ حیدر آبادی بینگن ہیں۔'' زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے۔

''جی نہیں یہ چائنا ٹاؤن ہے۔'' اشتیاق کہتا ہے۔ ''بالکل نئی ڈش ہے، کھا کر دیکھیے، جیسے چکھیے بالکل نیا مزا ہے۔''

''اٹھا کے لے جا ابھی یہاں سے ورنہ سر پر دے ماروں گا۔'' میں گرج کر کہتا ہوں، کیونکہ مجھے تو ڈش دیکھ کر ہی متلی ہونے لگتی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اٹھا کے لے گیا مگر بعد میں اس نے زرینہ سے کہا۔

''صاحب بھی کیسی ناانصافی کرتے ہیں چکھے بغیر ناپاس کر دیتے ہیں، کھانے کو۔''

اشتیاق موتی قلیہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے موتی قلیہ پکانے کی فرمائش کی گئی جب دستر خوان بچھا تو منجملہ دوسری چیزوں کے ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی چیز سامنے آئی۔

''یہ موتی قلیہ ہے۔'' جی نہیں اشتیاق فوراً بولے۔ ''یہ پیسٹ ہے۔''

''پیسٹ کیا؟'' تمہیں موتی قلیہ تیار کرنے کو کہا تھا کہ نہیں۔ زرینہ خفا ہو کر بولی۔

''موتی قلیہ بگڑ گیا اس لیے میں نے نئی ڈش تیار کر دی ہے۔ اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا تو اسے فوراً نیا نام دے کر دستر خوان پر پیش کر دیتے ہیں۔ اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی اعلیٰ خاندان کا لڑکا خود بخود بگڑ جائے اور اس کو بگاڑنے میں ان کا کوئی

ہاتھ نہ ہو۔''

اب کیا کہیں چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہوسکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا مگر مہمان موجود تھے اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم مہمانوں کو لیکر میٹنی شو دیکھنے چلے گئے اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ میٹنی شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے، بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے، آگ آگ میرا گھر بچاؤ۔ لینڈ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

''اشتیاق کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا معلوم؟'' لینڈ لارڈ اپنے سر کے بالوں کو نوچتے ہوئے بولا۔ ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں اور وہ دروازہ ہی نہیں کھولتا، اور اندر کچن میں شاید نشہ کر کے بے ہوش پڑا ہے۔

میں اور زرینہ دونوں نے چلا کر دروازہ کھلوایا۔ اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر پلٹے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں پتیلیوں کے سالن جل چکے تھے مگر خدا جانے ان میں اس نے کون سا مسالہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک انکی پتیلیوں سے اٹھ رہے تھے۔ ''آگ آگ'' لینڈ لارڈ غصے سے چیخ رہا تھا۔

''کدھر ہے آگ؟'' اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگا۔

زرینہ بولی۔ ''یہ بےچارے ایک گھنٹے سے چیخ رہے ہیں، دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں فائر بریگیڈ تک آ گیا اور کچن کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔''

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر چونکے شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگے، ایک انگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے۔ ''بحث چل رہی تھی۔''

''کیسی بحث۔'' زرینہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ ''تم یہاں اکیلے بیٹھے ہو۔''

''کورٹ کا مقدمہ تھا۔''

''کیسا مقدمہ؟''

''آبائی مکان کا مقدمہ تھا میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔''

''کدھر ہے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی۔'' زرینہ کا غصے سے پارہ چڑھنے لگا۔

''میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں خود ہی کورٹ ہوں، خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔'' اشتیاق نے بتایا۔

''مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟'' زرینہ نے دانت پیس کر کہا۔

''یہاں۔'' اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا اور سر جھکا لیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے ہٹنے لگا، میرا بھی۔ عمدہ باورچی ہونے کے باوجود اس کی خامیاں اب جان لیوا ثابت ہونے لگی، ادھر اشتیاق سے زیادہ اس کی بلی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اس سے بے اعتنائی تو نہ برتتا

تھا کیوں کہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کو توجہ دے مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے مداحوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر تھی۔ دو ایک بار وہ کمرے میں اٹھلاتی ہوئی آئیں مگر میں نے شش کر کے بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں دراصل سوئی نہ تھی سونے کا بہانہ کر رہی تھی وقت بھی بی گلشن نے وہ چنا تھا جو میرے دفتر سے آنے کا تھا، مقصد یہ تھا کہ ہم تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے یعنی جس قدر میں بے اعتنائی دکھا رہا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مصر تھیں۔ اس وقت میں ل ے جو انھیں بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آ کر انھیں دم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا بے حد خفا ہو کر غرائیں اور جھلا کر کمرے سے باہر چلی گئیں مگر اس کا بدلہ گلشن نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں سمبل کی ریشمیں روئی کے دونوں تکیے ادھیڑے پڑے ہیں اور گلشن انیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور سمبل ہوا میں اڑ رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا، میں جھپٹا مارنے کے لیے آگے بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دوسرے دروازے سے باہر اور بلی چلانے لگی۔ ''میاؤں میاؤں۔'' مگر آج میں قسم کھالی تھی آج میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر لیا، اور ڈرائینگ روم سے بیڈ روم سے کچن سے صحن سے باتھ روم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اسے پکڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں سے دبا کر اسے گھر سے باہر لے چلا، اشتیاق سہا ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ مگر وہ میرا غصہ دیکھ کر منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا صرف اس کے ہونٹوں کے کونے پھڑک

رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں نے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اس سڑک پر کئی کھڈے اور گڑھے تھے اور اس پر ان گنت وزنی ٹرک گھوں گھوں کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک قریب آتے ہوئے دیکھ کر یکایک گلشن کو زور سے جھلایا اور نشانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

ٹرک سڑک سے گزر گیا۔ چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر لیس کر لیٹی ہے پھر یکا یک وہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئی۔ دو ایک بار اس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا مگر ادھر ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت دوڑتی ہوئی چلی گئی اور پھر ہمارے گھر کبھی نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا، مگر گلشن کہیں نظر نہ آئی۔ چوتھے دن اس نے اپنا سامان باندھ لیا، اور بولا۔ ''صاحب میرا حساب کر دیجیے، میں جانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں۔''، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ زرینہ نے پوچھا۔

اشتیاق نے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا۔ ''بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلی کے ساتھ سلوک کیا وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اور وہ جو تمہاری بلی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا؟'' میں نے غصے سے بلند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملہ سلجھانے کے خیال سے بولی ''ارے ایک بلی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے، میں تجھے ایسی بلیاں لا دوں گی۔''

''نہیں وہ میری گلشن تھی۔'' اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی۔ جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

''ارے گلشن تھی کہ زلفن کہ کریمن، جو نام چاہے رکھ لینا۔'' میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سیکڑوں بلیاں گھومتی ہیں اس علاقے میں۔

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھے رخ موڑ کر زرینہ کی طرف ہو کر بولا۔ ''مجھے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے اب تو۔''

''کیوں؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''جب صاحب نے گلشن کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔''

''اپنے باپ کی طرح؟ کیا بکتے ہو؟'' زرینہ غصے سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحے توقف کیا پھر گھمبیر لہجے میں کہنے لگا ''اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشے کی حالت میں مجھے کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی، میں یقیناً مر جاتا مگر سڑک پر جہاں میں گرا، اس پر ایک بڑا گڈھا تھا اور میں اس گڈھے سے باہر نہ نکل سکا، اور رات کا وقت تھا دو ایک ٹرک پرے پرے گزرے گئے۔ پھر شاید میں ہوش میں آ گیا اور ماں دوہتڑ مار کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آ گیا اور وہ بھاگا بھاگا آیا اور سڑک کے گڈھے سے اٹھا کے اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا اور میرا منہ

چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں اس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی، اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر چھاتی سے لگا لیتا تھا۔ مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب اس نے مجھے غصے میں اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا، بالکل ویسا ہی چہرہ تھا اس وقت صاحب کا اس لیے میرا حساب کر دو۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اشتیاق میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگا، جیسے گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا۔

تین سال بعد ہمارا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ تو وہ ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا اور اس کا نام اب لالو کرمانی تھا اور وہ سندھی تھا اور سندھی زبان بڑے فراٹے سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پاجامہ اور کھدر کا ایک لمبا کرتا پہنتا تھا اور پہلی نظر میں کسی محلّہ کمیٹی کا کانگریسی نیتا معلوم ہوتا تھا۔ ''یہ کیا ڈھنگ ہیں تمہارے یہاں؟'' زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے پوچھا۔

''ادھر۔! بلڈنگ کا اکھا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے اس لیے ہم بھی سندھی بن گیا، بیگم صاحب کیا کریں پیٹ روٹی مانگتا ہے۔''

''کوئی بلی ولی پال رکھی ہے ادھر بھی۔'' میں نے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''صاحب ادھرے بمبئی میں جندا رہنا بھی مشکل ہے ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانے میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ رات کو اس کی دکان کے سامنے پڑا رہتا ہوں، صبح گیارہ بجے تک اس کی دکان میں سموسے بناتا

ہوں، پھر رام داس ما کی جانی کے دفتر جاتا ہوں۔''

''یہ ما کی جانی کون ہے؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''اصل ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں۔''

''تم کو کیا ملتا ہے؟''

''کمیشن ملتا ہے۔''

''کتنا۔''

''ما کی جانی کو ٹوئنٹی فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔'' اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے۔ ''ہم کو ون پرسنٹ۔''

''ون پرسنٹ؟'' زرینہ نے پوچھا، ''ون پرسنٹ آف واٹ۔''

اشتیاق بولے۔ ''ون پرسنٹ آف دی فائیو پرسنٹ آف دی ٹوئنٹی فائیو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ۔''

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے، آخر میں جب زرینہ نے کسی طرح اپنی ہنسی پر قابو پالیا تو بولے۔ ''آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔''

''کیسا ہے وہ فلیٹ؟''

اشتیاق انگلی پر کمرے گنواتے ہوئے بولے۔ ''ون بید روم، ون باتھ روم، ون بیڈ روم، مورون کچن، ون ہال اینڈ سپریٹس۔''

''یہ اینڈ سپریٹس کیا بلا ہے؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''بس اینڈ سپریٹس!'' اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف

دیکھا کوئی کہہ رہا ہو۔ایم اے کرنے بعد اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ؟ اینڈ سپر یٹس بیگم صاحب اشتیاق نے پھر سمجھایا۔ زرینہ نے یکا یک سمجھ کر کہا۔ ''اچھا، تمہارا مطلب ہے آل سپر یٹس یعنی ہر کمرہ دوسرے سے الگ الگ ہے۔''

''بس اینڈ سپر یٹس۔'' اشتیاق کے چہرے پر احساس برتری کی ایسی جھلک آئی گویا وہ کہہ رہا ہو۔افوہ کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی۔

زرینہ پھر ہنسنے لگی، میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''اور بھی کچھ کام کرتے ہو؟''

''جی ہاں ایک ٹوتھ پیسٹ تیار کیا ہے میری ٹوتھ پیسٹ۔''

''یہ میری کون ہے؟'' زرینہ نے چونک کر کہا۔

شرما کو بولے۔ ''چھوکری ہے۔''

''تمہاری منگیتر۔''

''جی نہیں۔''

سر ہلا کر بولے، ''ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے۔اس کی چھوکری ہے۔کوکن کے گاؤں میں یہ بڈھی اپنی چھوکری کی شادی بناتا ہے۔''

''تمہارے سنگ۔'' زرینہ نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں، کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ، ایلفر ڈاس کا نام ہے۔وہ بھی ادھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے۔مگر بڈھی بہت گریب ہے، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔اس لیے ہم نے میری ٹوتھ پیسٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے ٹائم بیچتا ہے اور

اس کا پیسہ اس کرسچین بڈھی کو دیتا ہے۔''

الو کا جنم کیوں اشتیاق۔ روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑتی تھی۔

''الو کا جنم اس لیے صاحب،'' اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا اشتیاق کو یعنی فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے۔ ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور الو بھی رات کو جاگتا ہے اس لیے بات سمجھیے ذرا، ذرا سوچیے کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔

''ارے الو کے پٹھے۔'' زرینہ نے دوپٹا منہ سے لگا کر یکایک چیخ کر کہا۔ ''بھاگ جا یہاں سے ورنہ چپل اتار کر اتنے ماروں گی.......... اتنے ماروں گی کہ.........زرینہ چپل اتارنے لگی، اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔''

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا۔ پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھ۔ پھر اس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو ڈھرے پر لگا کر اسے شاہی ٹکڑے بیچنے کے ترغیب دی۔ وہ سستے میں بن جائے گا۔ سیٹھ تمہارے ادھر ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بے کار میں پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا، خالی شکر کا خرچ ہے اور تھوڑی سی بالائی اشتیاق نے اسے سمجھایا اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑے رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو کرے گا۔

ایرانی مان گیا کیونکہ خرچا بہت کم تھا اس مٹھائی کا پہلے دن اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ

ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھائی بھی معلوم ہو، ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہوگئی کہ اشتیاق کو دن میں دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری بڑھتی دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ کک مقرر کر دیا۔ کچن میں کام کرنے والے نوکر اشتیاق کو استاد جی کہہ کر پکارتے تھے اور ہوٹل کا مالک

میں نے دہرا کر پوچھا۔ ناٹ الیون ون پرسنٹ آف دی فایو پرسنٹ آف دی ٹونٹی پرسنٹ فایو پرسنٹ آف دی ہینڈرڈ پرسنٹ؟

''نوسر۔'' اشتیاق نے سر ہلایا۔

''تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا، تم نے شاعری ترک کر دی ہے۔''

''جی اشتیاق نے اپنے ہاتھ کا ناخن دوسرے سے کریدتے ہوئے بولے۔ شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا، ایک مکھڑا کہا ہے۔''

''کیا''

نگاہیں نیچے کیے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چور نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوے بولے، صاحب بات یہ ہے کہ غزل سے بیگم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے غزل چھوڑ دیا مگر فلمی گیت ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن بہت چھوٹا ہوتا ہے کیا مطلب چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے فلمی گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے والا۔

''تو سناؤ؟'' میں نے بے چین ہو کر کہا۔

اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔

''او صنم! او صنم''

میں نے لیا۔

الو کا جنم

''تیرے لیے۔''

زرینہ کی بری حالت تھی منہ میں دوپٹا ٹھونسے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی اور اسے پوچھا، ''مگر''

''تاکہ اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سوا کہیں اور کر سکے۔ زرینہ بے حد تلخ ہوکر پوچھا۔''

یکا یک اشتیاق سٹپٹا گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے اور گال اور بھی زیادہ اندر دھنستے گئے اور اس کا چہرہ ایک ایسی کالی کھونپڑی کی طرح نظر آنے لگا جس پر صرف کھال کھال منڈی ہو، اسے دیکھ کر مجھے بہت رحم آیا وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے چاروں طرف سے دیواریں گر رہی ہوں اور اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ میں نے جلدی بات کا رخ پھرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ شعر و شاعری جاری ہے۔

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''کیوں'' میں نے پوچھا۔

''اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔'' اشتیاق نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

''ہیرو کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اشتیاق اپنا نام لے کو بولے۔''ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔''

''ویلن کون ہے؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''اور شاید دلیپ کمار نبھا جائے۔'' اشتیاق سوچ سوچ کر بولے ''ویلن کا رول بہت مشکل ہے۔''

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا۔ اور ''ہیروئن'' میں نے پوچھا۔

''فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔'' اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے باہر دیکھ رہا ہوں۔

''فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا اور پھر اسی کی انگریزی کا فقرہ

اشتیاق کو شاہی ٹکڑے کی مناسبت سے میرے دل کا ٹکڑا کہتا تھا۔

اگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور روح پر بہار آتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے۔ اس کے کلے بھرنے لگے تھے اور کالے رخساروں پر صحت کا اودا پن چھلکنے لگا تھا اور وہ کشتیاں اس کی پتلیوں کی جو اس کی آنکھوں میں ہر وقت بے چین اور مضطرب ہو کر تیرتی رہتی تھیں۔ اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی معلوم ہوتی تھیں۔ جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا۔ اس کے قریب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ یہ چوک کے نکڑ پر سامنے ٹیکسیوں کا اڈا تھا اور قریب ہی ایک نئی مارکیٹ کھل گئی تھی اس لیے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل

میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے نوکر چاکر اور کالجوں کے ٹیڈی بوائز اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار آوارہ گرد لونڈے جو کالج کی لڑکیوں سے زیادہ ٹیڈی معلوم ہوتے تھے۔ ان سب کا جمگھٹا اس ہوٹل میں اندر اور باہر رہتا تھا اور اس ہوٹل میں اشتیاق بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ آتے جاتے میں اسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک وہ اپنے ملگجے کپڑوں میں کبھی کچن کے اندر، کبھی کچن کے باہر بڑی مستعدی سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا دھو کر گیروے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پانچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ایرانی ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اس وقت اسے کام کی تلاش میں آئے ہوئے ادھر ادھر کے بہت سے لونڈے گھیر لیتے تھے، وہ ادھر ادھر بنگلوں اور فلیٹوں میں ان لڑکوں کو نوکر کرا دیتا کیونکہ ہاؤس ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کی بلڈنگوں میں اس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ جن لونڈوں کو وہ نوکری نہ دلوا سکتا انہیں دوسرے دن آنے کا مشورہ دے کر چلتا کرتا۔ پھر بیڑی سلگا کر لانڈری کے مالک سے باتیں کرتا جو اس کا ہم وطن تھا یعنی مرادآباد کا رہنے والا تھا۔ جس کے لیے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی قسم کا ایسا صابن بنانا چاہتا ہے جس میں خرچا بہت کم ہو اور کپڑے بھی بہت عمدہ دھل جائیں مگر اشتیاق ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

لانڈری سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہاؤس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا یا نئے گاہکوں کو لے کر مکان دکھانے کے لیے چلا جاتا، رات کو نو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی

ہوٹل میں کھانا کھاتا اور پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بیڑی سلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو باورچی کے جھونپڑے میں جا کر سو رہتا کیوں کہ اب وہ بڑا آدمی ہو رگیا تھا، وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کا جھونپڑا بارہویں نمبر ایک سڑک کے پیچھے ایک چھوٹے سے خالی پلاٹ پر تھا اور اس کی بیوی بچہ ہونے کے باوجود اپنے میکے ٹیڑھی گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی ہوئی تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی ۔تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے۔ سنتو نے استاد جی سے کہا تھا۔

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں بکری دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے، اس لیے مجھے دو ماہ بعد بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی غبن کیا ہے۔''

''آج تک ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔'' ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

''پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا۔''

''نہیں کام اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔''

''پھر۔''

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر جلدی سے بند کر لیا، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''اس کا بھیجا پھر تیلا ہے ہم اس کو ستر روپیہ پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اس نے خرچ کر دیا۔''

''اوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائس کا بل ہو گیا۔''

''پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائیس،'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا، وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔''

''ہم جانتا ہے اس لیے ہم بولتا ہے ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کر بولا۔ وہ خود پانچ سو تو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس کو منع نہیں کرتا تھا، مگر وہ خود نہیں پیتا تھا ادھر ادھر کے بے کار اور لفنگے لونڈے لوگ جو ادھر ادھر آجو باجو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے لیے آتا ہے وہ ان کو بھوکے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا صاحب جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھے گا۔'' اس لیے ہم نے اس کو نکال دیا۔

''بہت اچھا کیا۔'' میں نے ایرانی کے آگے پیسے گنتے ہوئے رکھتے ہوئے کہا ''دو پیسہ کم ہے۔''

''ساری۔'' کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے دو پیسے اور دیئے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اس سے پوچھا، ''تو آج کل اشتیاق کہاں ہے؟''

''جیل میں ہے۔''

''جیل میں۔'' میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ ''تم نے بیچارے کو جیل بھجوا دیا؟''

''ہم نے کہاں پہنچایا ہے، صاحب وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے شراب کی سمگلنگ کے دھندے میں۔''

''اچھا'' ''یہ دھندا نہیں کرتا صاحب، مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹائم میں یہ دھندا کرتا تھا اور ادھر ادھر کی بلڈنگوں میں رات کو باٹلی پہنچاتا تھا۔ ایرانی بولا۔ ''پھر

ایک رات کو پولیس نے اس کے جھونپڑے پر چھاپہ مارا چھ باٹلی پکڑا گیا تو اشتیاق بولا سنتو بے گناہ ہے۔ میں نے چھ بوتل شراب ادھر الا کے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سجا ہو گئی ہے۔''

''اس نے ایسا کیوں بولا؟''

وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے؟ ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سجا چٹکی بجاتے کاٹ لے گا، مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے سنو کو لے کر اس کے جھونپڑے میں آئے گی تو خالی جھونپڑا دیکھ کر روئے گی۔

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا۔ ''بھیجا پھریلا ہے اس کا۔''

زرینہ کو خیال آیا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آئے گا، لیکن جب تین ماہ سے اوپر کئی دن گزرے گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اسے کچھ مایوسی سی ہوئی، مایوسی مجھے بھی ہوئی پھر میں نے سوچا کہا اشتیاق ہمارے گھر نہیں آئے گا تو ممکن ہے ادھر ادھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا، پر ادھر بھی نہیں۔ سنتو باورچی سے پوچھا معلوم ہوا کہ اس کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم دونوں نے سوچا ممکن ہے اشتیاق مارے شرم کے یہ علاقہ چھوڑ گیا ہو۔ یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو اڑھائی ماہ اور گزر گئے تو اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز ہم نے یکا یک اسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زر زر آور خان کے ہاں ہماری دعوت تھی، جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی سمجھ گئے کہ کس کا اسٹائل ہے۔ لقمہ چکھتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کے دیکھا مگر

ہم دونوں چپ رہے، کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے کالی پتلون کے اوپر لال بش شرٹ اور اس کے اوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ان ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجالاتے ہوئے، شاعروں کے انداز میں داد بٹورنے لگے۔

نہ میں نے اور نہ زرینہ نے اس وقت انہیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اس وقت ہمارا رویہ سمجھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کر بتایا۔ ''بہت اچھا کک مل گیا ہے، مجھے اشتیاق احمد خان نام ہے اور اس کا اپنی طرف کا ہے۔ قاضی خیل کا پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے۔ حالانکہ بچپن سے ادھر رہا ہے، پھر کھانا غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے، میرے کچن کا خرچ ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے، پورے ڈھائی سو روپے سنتی ہو؟ میں اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔''

زرینہ انجان بن کر بولی۔ ''آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔''

''ارے شریف ایسا شریف۔'' نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں، میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور میرے سب سے چھوٹے بچے، نجو کو تو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کوئی سگی ماں اس کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ نجو کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے کہ نجو موٹر مانگ رہا تھا، میں نے کہا لا دوں گی، میں ٹال رہی تھی کیوں کہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں پرانے ہو گئے ہیں، ذرا تو کیا ہوا۔ نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کے خوشی سے بولی۔ ''یہ

موا اشتیاق دس روپے موٹر میرے نجو کے لیے لے آیا۔ تو میں نے غصے سے جھلا کہا میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی۔ تو موا بولا۔ نہ دیجیے گا بیگم صاحب میں تو اپنے پیسوں سے موٹر لایا ہوں نجو کے لیے۔ اس پر وہ غصے سے گرج کر بولے تم کو کس نے کہا تھا، نجو کے لیے موٹر لانے کو تو اشتیاق پہلے تو ان کی گرج سن کر سہم گیا پھر ہولے سے سر اٹھا کر بولا۔ صاحب میں نجو کا کہنا نہیں ٹال سکتا، جو کہیں گے میں ضرور لاؤں گا۔ اس نے ایسے مضبوط لہجے میں ان سے بات کی کہ ان کا سارا غصہ اتر گیا، مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے میں بھی کیا بولتی بہن؟'' چپ ہو کر سروتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مسکرا مسکرا کر نصرت کی باتیں سنتی رہی مگر اس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی جتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پہلے سے جانتا ہے، ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے۔ اس کی خامیاں جتانے سے کیا فائدہ؟ اور خان صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا، بال ماتھے پر نہیں لٹکتے تھے، ذہنی طور پر بہت کم غائب رہتا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خان صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا، حالانکہ ان کی دیکھ بھال کے لیے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں، مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی ملازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے سکھ کا سانس لیا۔ ''چلو اشتیاق نارمل تو ہوا۔''

ایک رات زور سے گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا، میں نے گھبرا کر دروازہ

کھولا۔ باہر سردار زورآور خان کا ڈرائیور حامد خان تھا۔

''حضور جلدی چلیے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔''

''کیا بات ہے حامد؟'' میں نے پوچھا۔

''اشتیاق نے زہر کھالیا ہے۔''

''ارے۔'' میرے منہ سے نکلا۔

ہاں صاحب، اشتیاق نے زہر کھالیا ہے، اور سردار صاحب پونا میں ہیں۔ گھر پر بیگم صاحب کے دو بھائی ہیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے میں نہیں آ سکتا اور اشتیاق مر رہا ہے۔

زرینہ میرے پیچھے کھڑی کانپ رہی تھی، لرزتے ہوئے لہجے میں بولی ''تم جلدی چلے جاؤ، بے چاری نصرت سخت پریشان ہوگی؟''

خان صاحب کے ڈرائینگ روم میں عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور ان کے بھائی بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے صم بکم کھڑے تھے، ''کیا مر گیا؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''نہیں ابھی تو زندہ ہے۔'' ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔

میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی سینے کے زیرو بم میں نزخرے کی گھر گھراہٹ تھی اور نبض ٹوٹ رہی تھی۔ نصرت ایک بھوری شال اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

''کب اس نے زہر کھایا؟'' میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی جیسے اس نے میرا سوال سنا تک نہ ہو۔ نصرت کا چھوٹا بھائی بولا۔ ''کوئی دو بجے کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سنی، کوئی آہستہ آہستہ سے مجھے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب میں جاگا تو معلوم ہوا، اشتیاق ہے وہ باورچی خانے سے رینگتا رینگتا میرے کمرے میں پہنچا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے بچا لیجیے، میں نے زہر کھالیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کون سا زہر؟''

بولا۔ ''ٹک ٹو۔''

''ٹک ٹو کیا؟''

''ٹک ٹو، ٹیک ٹو۔'' اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور آواز میں لکنت تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا ٹیک ٹونٹی لیکن اس سے منہ سے نکلتا تھا صرف ٹک ٹو پھر وہ میرے چارپائی سے لگ کر قے کرنے لگا۔ میں نے مزید داستان سننا بے کار سمجھ کر فوراً کہا۔ اسے اٹھا کر نیچے گاڑی میں فوراً ہسپتال لے جائیں گے۔

''مگر پولیس۔'' نصرت کانپ کر بولی۔

''پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''نزدیک کا ہسپتال کون سا ہے؟''

''جاناوتی۔''

''یہاں سے کتنی دور ہوگا؟''

''کوئی چار میل۔''

''جلدی کرو۔''

جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے روشنی کے قمقمے پانی میں بھیگے ہوئے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں، بھیگی ہوئی سڑک پہ کہیں کہیں روشنی کے پھٹے چیتھڑے نظر آتے پھر اندھیرا انہیں کھا جاتا پھر تنگ و تاریک گڑھوں کی ماری ہوئی ایک سڑک پر کار یوں لڑکھڑا کر چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت لٹا کر رات کی اوٹ میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں۔

اے فارم بھرو!

بی فارم بھرو!

زندگی! تم بھی تو رکو۔

مشتاق کا سر بھورے رنگ کے آئل کلاتھ کے گدوں پڑ لٹکا ہے اس کی آنکھیں کسی گہرے بھورے گڑھے میں جا گری ہیں اور ران پر یادوں کا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا چل رہا ہے۔

''یہ پچھتر روپیہ ایڈوانس دو۔''

''یہ رسید لو۔''

''وہ چل، مریض کو کمرہ نمبر 7 میں لے جاؤ اوپر، لفٹ سے میں ابھی ڈاکٹر کو ٹھاری کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔''

باہر سے ایک ٹرک گوڑتا ہے گھوں گھوں اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے ہوں ہوں۔

آئل کلاتھ کا بھورا بستر اپنے بالوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعے لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جا کر رک جاتی ہے۔ بستر برآمدے سے گزر رہا ہے۔ کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں سات نمبر کا پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں اور ہم باہر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

لمبے کوریڈور میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں، اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں کہیں کہیں ہولے ہولے کوئی کراہتا ہے کوئی دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"غبن کیا ہوگا؟" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔

بہن نے ہولے ہولے گھر کا سارا خرچا اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا اور ہر وقت چار پانچ سو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے۔ کل بہن نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا آج اس نے زہر کھا لیا میرا خیال ہے کہ۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس برائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اس نے ایک دھیلے کی چوری نہیں کی، میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مراد آباد سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے کا مقدمے کا فیصلہ اس کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غم اسے بہت ہوا ہے۔"

''اجی نہیں۔'' بڈھا حامد اپنی گھنی بھنوؤں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''اشتیاق کو مکان دکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی، یہ سب لونڈیا کا چکر ہے گلشن کا۔''

''گلشن۔'' میرے کان کھڑے ہوئے گلشن کون ہے؟ میرے ذہن میں ایک بلی کودنے لگی۔

ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے، بڑی بدصورت لونڈیا ہے مگر سولہ سترہ برس کی ہے، بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے اس کا نام گلشن ہے اور صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔

''ارے۔'' میں چونک گیا۔

''جی ہاں!'' اسی لونڈیا کے چکر میں زہر کھالیا ہے۔

''وہ کیسے؟''

''پہلے تو صاحب کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو، یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگا میں اس وجہ سے اس کو نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا، کام تو ٹھیک کرتی ہے۔ مگر اشتیاق نہیں مانے برابر شکایت کرتے مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے، تو معلوم نہیں کب انھوں نے ہار مانی اور کب اشتیاق کا رویہ بدلا۔ یہ اس لڑکی پر مہربان ہونے لگے، دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے، یہ اس کو کافی پلانے لگے۔ جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے، تو ایک دم بدک گئی اور اس دن سے اس نے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اس نے اشتیاق کو

بازار سے دیسی صابن لانے کے لیے کہا تو اس کے لیے انگریزی صابن لے آئے، اس نے کھوپرے کا تیل لگالیا، تو یہ گلزار ہئیر آئل نمبرون اٹھالائے۔ کل گلشن ماں کا خط آیا، جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی، دروازہ پر کھڑے چوروں کی طرح سنتے رہے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا اس نے گلشن کی شادی کی بات چیت مکمل کر لی ہے۔ لڑکا کسی سیمنٹ کی فیکٹری میں دربان ہے یہ خالی باورچی تھے، وہ انہیں منہ کیا لگاتی بس جب سے یہ سنا کچن ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟'' بولے کچھ نہیں۔ اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''مگر اب جینا بے کار ہے،'' آج دوپہر کی بات ہے رات کو انہوں نے زہر کھا لیا........ حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ ''مگر زہر کھانے سے پہلے اس کمبخت لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟''

''بالکل نہیں صاحب،'' حامد خفا ہو کر بولے۔ ''بالکل یک طرفہ عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے۔ ان دس دنوں میں انہوں نے اس لڑکی سے نفرت بھی کی، دوستی کی ابتدا بھی کی، محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا، لڑکی کو تو کچھ خبر نہیں ہے صاحب، وہ تو ایسی بدصورت ہے ایسی بھیجے کی خالی کہ اسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اس سے عشق کر سکتا ہے۔''

حامد چونکے بڈھے تھے اور زندگی کے اس دور سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے داستان سناتے وقت ان کے لہجے کی

شدید تلخی جس طرح ان کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے، اور مجھے دیکھ کر بولے۔ ''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائین پر رکھ دیا ہے۔ کھانے کو دوا دی ہے، انجکشن دے دیئے ہیں۔ کچھ لکھ دیئے ہیں۔''

''شکریہ ڈاکٹر صاحب، مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے۔''

''ہوش میں تو ہے مگر ابھی بہت کمزور ہے۔ ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہو گا۔'' ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''صرف آپ اس سے چند منٹ کے لیے مل لیں۔ میں نے تھانے فون کر دیا ہے، کسی وقت بھی پولیس کا انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لیے آ سکتا ہے کیوں کہ مریض کی حالت بہت نازک ہے۔''

اتنا کہہ کر ڈاکٹر کوٹھاری چلے گئے۔ تو نصرت کا چھوٹا بھائی برافروختہ ہو کے بولا۔ ''خان صاحب گھر پر نہیں ہیں، اور یہاں پولیس کے سامنے نہ جانے کس کس کے بیان ہوں گے۔ الو کے پٹھے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے مر جاتا، کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جاتا، کہیں مر جاتا اس گھر سے دور رہ کر ہی مرتا اور یوں ہم سب کو پریشان کر کے تو زہر نہ کھاتا۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' میں نے کہا۔ ''مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولت کا خیال کر کے مرنا چاہیے، اس سلسلے میں اگر آپ ایک رہنمائے خودکشی شائع کریں تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔'' اتنا کہہ کر میں کمرہ نمبر سات میں داخل

ہوا۔

اتفاق سے اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔نرس کوئی دوا لانے کے لیے گئی تھی، اشتیاق گہرے تکیوں میں سر لٹکائے لیٹا تھا اس کے دائیں بازو کی رگ میں سیلائین جا رہا تھا، دوسرا بازو اس کے سینے پر تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے سیاہ چہرے کے پیچھے سفید تکیوں سے پرے کھڑکی کی پلکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے اور کانچ کی سطح پر روشنی اور سائے امید و بیم کی کش مکش طرح لرزاں تھے۔

''اشتیاق۔''میں نے اس کے بستر کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا۔''اشتیاق سنو''

میں نے پھر ذرا اونچی سرگوشی میں کہا۔''کان کھول کے سنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔نرس آ رہی ہے۔''

اشتیاق نے آنکھیں کھولیں اور جب میں نے دیکھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے تو میں نے اس کے قریب جھک کر کہا۔''کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر تمہارے پاس بیان قلم بند کرنے کے لیے آ جائے گا۔اس سے صرف یہ کہنا ہو گا کہ تمہارے پیٹ میں درد تھا اور تم امرت دھارا لے کر سو گئے تھے۔ اتفاق سے کچن میں تمہارے سرہانے ٹیک ٹونٹی کی شیشی بھی پڑی تھی اور وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی امرت دھارا کی اس لیے رات کو جب تمہارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی جگہ ٹیک ٹونٹی پی لی غلطی سے پی لی۔بس اور مت کچھ کہنا، سمجھتے ہو۔''

''اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا، آنکھوں کی پتلیاں

نیم ساکت، ہونٹ اندر بھنچے ہوئے رخساروں کے گڈھے گہری اور اتھا تاریکی میں کھوئے ہوئے، سینہ کھلا اور اجاڑ خشک بالوں سے ڈھکا ہوا۔ کسی ویران جزیرے کی مانند اور دبلی پتلی پسلیاں کسی شکستہ معبد کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے سوکھے تالاب کی طرف جاتی ہوئی۔''

اشتیاق! اشتیاق تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے اس کے سر پر جھک کر پوچھا۔

اس کا چہرہ دیر تک ساکت رہا، جیسے اس نے میرا سوال نہ سنا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے پر سرکنے لگا، دھیرے دھیرے وہ اپنا سینہ انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا۔ ''سینہ خالی ہے۔''

''سینہ خالی ہے، کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے اور انس ان کا یہ خالی سینہ دم نہ بھر سکے، مسیح نہ بھر سکے اور حسین نہ بھر سکے تو تم کیا بھروگے احمق باورچی'' ارے اس سینے کے اندر حوفناک گڈھے ہیں اور گہری کھائیاں، کیسے کیسے بسیط خلا ہیں جن کے اندر تم کہاں سے کہاں کوڑا کباڑا کر ڈالتے رہے ہوتا کہ کسی طرح یہ خلا بھر جائے۔ پہلے تو تم نے اس زنخے نواب کو اس میں پھینکا پھر ایک بلی کو دم سے باندھ کر اس میں اٹکا دیا، پھر سیکڑوں کپ چائے کے تم نے اس کے اندر انڈیل دیئے اور ڈبل روٹیاں کاٹ کاٹ کر اس کے اندر پھینکتے رہے، تم میری ٹوتھ پیسٹ تیار کرتے رہے اور خود بے گھر رہ کر دوسروں کے بچوں لیے بسے گھر ڈھونڈتے رہے اور اپنے بچوں کی مایوسی میں دوسرے کے بچوں سے محبت کرتے مگر تم گلشن کو کبھی بھول نہ سکے اور کسی طرح یہ خلا پر نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کانٹے چنتے رہے اور بے قرار اور مضطرب ہو کر ایک پیشے سے دوسرے پیشے کی چکی میں گھستے رہے تا کہ

کسی طرح تم وہ خلا بھر سکو۔ جسے صرف عورت کی محبت بھر سکتی ہے...... پگلے۔

نرس آ گئی، میں نے ایک لمحے کے لیے اشتیاق کا خاموش ستا ہوا بدہیئت چہرہ دیکھا، تکیوں کے پیچھے بند کھڑکی کی پلکوں سے چند قطرے ہوا سے لڑ کر ٹوٹے اور کانچ کے رخساروں پر بہتے ہوئے چلے گئے.......... میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

پھول کی تنہائی

''تمہیں کس طرح کا مکان چاہیے؟''

کرائے کے مکانوں کے دلال نے مجھ سے پوچھا۔ وہ مجھ سے تم کہہ کر کبھی مخاطب نہ ہوتا۔ لیکن اس نے میری بوسیدہ پتلون پر نظر ڈال لی تھی۔

''مجھے ایسا مکان چاہیے جس میں کمرہ تو چاہے ایک ہو۔ لیکن اس کے ساتھ غسلخانہ ہو۔ سامنے لان ہو۔ لان میں ہری گھاس ہو اور گھاس کے کنارے پھول ہوں۔''

''پھولوں کے درمیان دھوپ کھانے والی چھتری ہو۔ چھتری کے نیچے ایک حسینہ بیٹھی ہو؟''

دلال نے تصویر مکمل کی۔

''مسٹر! تمہیں مکان تلاش کرنے کی بجائے اپنی عقل کا بیمہ کرانا چاہیے۔''

آدمی سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے مکانوں کے دلال کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر سوچا۔

دلال نے میرے قریب آ کر بہت آہستہ سے پوچھا۔

''کرایہ کیا دو گے؟''

''پچیس روپے۔''

''پچیس روپے؟'' دلال زور سے چیخا۔

''پچیس روپے میں صرف گھاس آ سکتی ہے! مکان نہیں..........''

میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں مکان دکھانے کے لیے تین روپے ادا کر دیئے ہیں ۔یہ بات تمہیں رقم وصول کرنے سے پہلے کہنی چاہیے تھی ۔اب سیدھے سادھے مکان دکھاؤ۔''

دل تین روپوں سے بندھا بندھا ایک اڑیل ٹٹو کی طرح چلنے لگا۔ میں نے سوچا۔

ہر شخص کے گلے میں ایک رسی ہوتی ہے، تین روپے یا تین سو روپے والی، یا تین ہزار والی یا تین لاکھ والی ۔لیکن رسی ہر ایک کے گلے میں ہوتی ہے یوں تو مجھے بھی اپنے گلے لیے رسی کی تلاش تھی لیکن روپے والی نہیں پھانسی والی! میں نے مر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چلتے چلتے میرے دل نے مجھ سے پوچھا۔

''جب تم مر جانے کا فیصلہ ہی کر چکے ہو تو مکان تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے اپنے دل سے کہا۔

''تم بیچ میں مت بولو۔تمہاری وجہ سے میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔تمہاری وجہ سے غلط عورت سے محبت کی ۔اپنے لیے غلط پیشے اختیار کیا۔اپنے دوست غلط چنے ۔ساری عمر غلط دھڑے پر چلا۔اب تم میرے اور میری موت کے درمیان بولنے والے کون ہوتے ہو............؟''

''میں بولتا کہاں ہوں؟''

دل نے کہا۔

انتہائی انکساری سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر جب مرنا ٹھہرا تو مکان تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ ایک پیڑ تلاش کر لیا جائے۔

ایک دریا، جھیل یا ریل گاڑی کا گھومتا ہوا پہیہ یا کوئی تیز سا چٹکی بھر زہر..........!

''تم بڑے احمق ہو!''

میں نے دل سے کہا۔

آج تک تم مجھے نہ سمجھ سکے مجھ جیسا انسان ایک عامیانہ اور سستی قسم کی موت کیسے مر سکتا ہے۔ میں ایک بہار افروز موت چاہتا ہوں۔

ایک خوبصورت کمرہ، لیمپ شیڈ کی مدھم مدھم روشنی میں میرے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا آخری جام، چھت کے پنکھے کے ہک سے لٹکتی ریشمی ڈوری میں میرا جھومتا ہوا جسم اور کھڑکی سے باہر ایک خوبصورت لان۔

لان میں ہری ہری گھاس، گھاس کے کنارے پھول، دھوپ کھانے والی چھتری کے نیچے بیٹھی ہوئی حسینہ۔ چاہے وہ ہمسائے کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

''رات کو دھوپ کہاں سے آئے گی اور وہ حسینہ رات کے وقت کھلی چھتری میں کیوں تمہارے لیے ٹھہرے گی؟''

دل نے پوچھا۔

''تو میں دن میں خودکشی کر لوں گا۔''

میں نے دل سے کہا۔

''مگر تم شٹ اپ ہو جاؤ۔''

دل چپ ہو گیا۔

سامنے ایک مکان بھی آ گیا۔

عمدہ مکان تھا۔ ایک لہریئے دار سیڑھی پر چڑھ کر پہلی منزل پر ایک خوبصورت سا کمرہ تھا ہر دیوار کا رنگ الگ تھا۔ گرے، گولڈ، نارنجی، قرمزی، دیوار گیر وارڈ روب نیلے پتھر والا آتش دان، ایک ملحقہ کمرہ اور بھی تھا۔

دیواریں زرد، گلابی بنفشی اور مارون رنگ کی۔ اس کمرے کے ایک طرف بار بنی ہوئی تھی۔ اس سے ملحق ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دو وارڈ روب تھے۔ ایک میرے لیے اور ایک میری بیوی کے لیے دو دیوار گیر آئینے تھے۔

پہلے دو سال عشق کرنے کے لیے اور اس کے بعد ساری زندگی منہ چڑانے کے لیے۔ میں فرش پر الٹے سلیپر، گندے پیٹی کوٹ اور بچے کی.......... کا تصور کرنے لگا۔

یہ تصور اس قدر خوش آہند تھا کہ میں جلدی سے دروازہ کھول کر ملحقہ غسلخانہ میں داخل ہو گیا۔ غسل خانہ بہت بڑا صاف ستھرا تھا۔ فرش پر سفید ٹائلیں، دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں۔ ہرے رنگ کی واش بیسن اور اسی رنگ کا باتھ ٹب، سامنے کھڑکی سے نچلی منزل کا برآمدہ اور برآمدے سے باہر کا لان نظر آتا تھا۔ جس پر ہری ہری گھاس کے کنارے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے قریب سات رنگوں والی دھوپ چھتری کے نیچے ایک سترہ اٹھارہ برس کی حسینہ دنیا کا عظیم ترین ادب یعنی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔

''آہا۔ خودکشی کرنے کے لیے کس قدر عمدہ جگہ ہے۔''

پھر میں نے فوراً مڑ کر دلال سے پوچھا۔

''اس کا کرایہ کتنا ہوگا؟''

''چار سو روپے۔''

''احمق''

میں نے برافروختہ ہو کر کہا۔

''میں نے تم سے پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا تھا!''

دلال مجھ سے کچھ کہے بغیر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

دوسرا مکان جو دلال نے مجھے دکھایا وہ بھی اچھا خاصا تھا۔ پہلے مکان کا سا سازوسامان اس میں نہ تھا۔ نہ نازو ادا کی کیفیت، نہ دیواروں کا وہ رنگ و روپ مگر عمدہ اور صاف ستھرا ضرور تھا۔

کمرے صرف دو تھے مگر دونوں ایک ہی غسل خانے میں کھلتے تھے۔ ایک طرف کچن تھا۔ کچن سے باہر برآمدے کے نیچے ایک خوشنما صحن میں ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی۔

''اس میں پھول کہاں ہیں؟''

میں نے ددلال سے پوچھا۔

''پھول تم خود اگا سکتے ہو۔'' وہ بولا۔

''دھوپ والی چھتری خرید سکتے ہو۔ چھتری کے نیچے تم کسی حسینہ کی بجائے

اپنی بیوی کو بٹھا سکتے ہو۔''

''پھول اگانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔

''دھوپ والی چھتری کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اور بیوی؟ میاں اگر میرے پاس بیوی ہوتی تو میں مکان ڈھونڈتا؟''

ایک کچن نہ ڈھونڈتا؟ اچھا خیر! جس کام کے لیے مجھے یہ مکان چاہیے اس کے لیے یہ بھی ٹھیک رہے گا۔ میں پھولوں کا ایک گملا ان میں رکھ دوں گا۔

'' گملے کے اوپر دھوپ والی چھتری کے بجائے اپنی کالی، بوسیدہ سیاہ برساتی چھتری رکھ دوں گا۔ اور اس کے اندر ایک حسینہ کا تصور بھی کر لوں گا۔ مگر اس کا کرایہ کیا ہو گا؟''

''ڈھائی سو روپے۔''

''احمق ڈھائی سو والا مکان کیوں دکھاتے ہو۔ مجھے صرف پچیس روپے والا مکان چاہیے۔''

دلال نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ چپکے سے مکان سے باہر ہو گیا۔

تیسرا مکان جو میں نے دیکھا۔ سب سے پہلے غسل خانہ آتا تھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرہ آتا تھا۔

کمرے سے ملحق ایک کچن بھی تھا۔ حالانکہ غسل خانہ ہونا چاہیے تھا۔

جب میں نے دلال سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''اس علاقے میں جتنے مکان بنے ہوئے ہیں ان میں رہنے والے کمرے

کے ساتھ ہی کچن رکھا گیا ہے،اور غسل خانہ سیڑھیوں میں!''

''یہ کیوں؟''

''یہ اس لیے کہ عورت کچن میں رہ کر ہر وقت اپنے شوہر پر نظر رکھ سکتی ہے دیکھو اس کچن کے ساتھ والا کمرہ نیچے جانے والی سیڑھی کے سامنے غسل خانہ تک نظر آتا ہے۔''

میں نے کہا۔

''خیریت گزری، میں نے کبھی کوئی بیوی نہیں پالی۔اس لیے میں کسی کی نگہبانی سے نہیں ڈرتا۔''

رہا غلسخانے کے دور ہونے کا سوال۔تو میرا کیا ہے، میں غسل خانے کو کچن اور کچن اور غسل خانے کی طرح استعمال کرلوں گا۔مجھے تو دونوں ایک ہی طرح کے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دلال نے میری فراست کی داد دیتے ہوئے کہا۔

''وہ آپ جانیں اور مالک جانے۔اگر یہ مکان آپ کو پسند ہے تو نکالیے سو روپے!''

''سو روپے!''

میں نے چیخ کر کہا۔

'' کیسے سو روپے؟''

''سو روپے اس کا ماہانہ کرایہ ہوگا۔''

''ارے بھائی!''

میں نے ہاتھ جوڑ کر دلال سے کہا۔

''میں نے صرف پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا ہے اور تم ہو کہ سیکڑوں کی بات کرتے نہیں تھکتے۔''

''میرا کام تو مکان دکھانا ہے۔ کیا معلوم آپ کو کون سا مکان پسند آ جائے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ پچیس روپے والا مکان ڈھونڈنے آتے ہیں اور چار سو والا مکان لے لیتے ہیں۔''

ایسے بھی دیکھے ہیں کہ چار سو والا مکان لینے نکلتے ہیں اور پچیس روپے والے مکان پر قانع ہو جاتے ہیں۔ گاہک کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اب دلال جس بلڈنگ کے اندر مجھ کو لے گیا۔ وہ پانچ منزل والی اور جہاز نما تھی۔ اور اس کی چھت سے کنکریٹ کے چھتے پر ایک دخانی جہاز کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ S.S.ATMARAM MULTAN دلال نے کہا۔ ''اس بلڈنگ کے اندر گوشت کھانا منع ہے۔ پیاز کھانا منع ہے۔ شراب پینا منع ہے!''

''تو یہاں بیوی کے ساتھ رہنا بھی منع ہو گا۔''

میں نے پوچھا۔

دلال حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''پھر یہاں سوچنا بھی منع ہو گا۔ آسمان کی طرف تکنا بھی منع ہے، زور سے قہقہہ لگانا بھی منع ہو گا۔ بستر پر اوندھے لیٹ کے سگریٹ پینا بھی منع ہو گا۔ کندھے پر تولیہ ڈال کر اور دروازے پر کھڑے ہو کر سیڑھیوں سے اترتی ہوئی کسی شوخ

حسینہ کو دیکھنا بھی منع ہوگا۔ مسٹر میں مکان دیکھنے آیا ہوں۔ ونوبا بھاوے آشرم میں داخلہ لینے نہیں آیا............!''

یہ کہہ کر میں مکان سے باہر ہو گیا۔

دلال شرم سے سر جھکائے میرے پیچھے آ گیا۔

اب دلال مجھے جس مکان میں لے گیا وہ واقعی پچیس روپے والا مکان معلوم ہوتا تھا۔ نہ لان، نہ گھاس، نہ پھول۔ چوتھی منزل پر ایک کمرہ تھا، کھڑکیوں پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ تاکہ مکان کے تقاضوں سے گھبرا کر کرایہ دار کھڑکی سے نہ کود سکے۔

دیواروں پر تیس برس پرانی سفیدی تھی جو اب سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ چھت کے سیاہ جالوں کے درمیان بجلی کا ایک پرانا پنکھا لٹک رہا تھا۔

میں نے اپنے تصور میں منظور کر لیا تھا کہ چلو لان نہ سہی، گھاس نہ سہی، پھول نہ سہی، حسینہ نہ سہی، اس کمرے میں پنکھے کا ہک تو ہے، جس سے لٹک کر جان تو دی جا سکتی ہے۔

''مگر غسل خانہ کہاں ہے؟''

''وہ ساتھ ہے۔''

دلال نے ایک کونے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں جلدی سے غسل خانے میں جا گھسا۔ غسل خانہ میں بڑی بڑی آنکھوں والی ایک لحیم شحیم عورت ذبح شدہ مرغی کے پر نوچ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر ہو غنچہ دہن ہنس دی اور جب اس کا موٹے موٹے ہونٹ والا

اٹھارہ انچ لمبا غنچہ پوری طرح کھلا تو مجھے اس کے اندر پانی کی پیک میں رنگے ہوئے دانت بہت خطرناک دکھائی دیئے۔ میں گھبرا کر پیچھے لوٹنے ہی والا تھا کہ اس کافر ادا نے اپنے پہاڑ جیسے کولھے مٹکا کر کہا۔

''تم نئے کرایہ دار معلوم ہوتے ہو؟''

''معلوم ہوتا ہوں کہ نہیں البتہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، یہ غسل خانہ کس کا ہے، آپ کا یا میرا؟''

''تمہارا بھی اور میرا بھی۔''

اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے زندگی بھر کا میرا اور اس کا رشتہ پکا ہو گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر ایک قدم اور پیچھے ہٹایا۔ اس نے فوراً ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔

''تم آ جاؤ۔ فکر نہ کرو، مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں گھبرا کر دروازے میں پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کا آخری پر زور سے نوچ کر اپنے غنچے میں لے لیا اور اس سے دانت صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اب پچاس روپے میں مالک مکان کمرے کے ساتھ الگ غسل خانہ دینے سے تو رہا۔''

میں نے بلڈنگ سے باہر آ کر کہا۔

''اگر تم مجھے پچیس روپے والا مکان نہیں دکھا سکتے تو میرے تین روپے واپس کر دو۔''

دلال نے کہا۔

''شریفوں کے علاقے میں تو پچیس روپے والا مکان نہیں مل سکتا۔ ہاں اگر آپ گندی بستی میں رہنے پر اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو پچیس روپے والا مکان دلا سکتا ہوں۔''

''چلو چلو مکان دکھاؤ، باتیں نہ بناؤ۔''

وہ مجھے گندی بستی میں لے گیا۔ جو شہر کا سب سے گندا علاقہ تھا۔ جہاں شہر کے نہایت غریب لوگ رہتے تھے۔ جہاں تنگ گلیاں تھیں۔ غلاظت کے انبار تھے۔ کھلی موریاں تھیں۔

نکڑ پر اس نے گندی بستی کے دلال کو الگ لے جا کر کچھ باتیں کیں۔ پھر وہ دونوں میرے پاس واپس آئے اور میرے دلال نے مجھ سے کہا۔

''یہ کہتا ہے کہ اس بستی میں پچیس روپے والا مکان نہیں ہے۔''

''تو پھر کس کرائے کا مکان ہے؟''

''سولہ روپے والا مکان ہے۔''

''سولہ روپے والا مکان بھی خالی نہیں ہے۔ البتہ ایک ہے، لیکن وہ تمہارے لائق نہیں۔''

''میرے لائق کیوں نہیں؟''

میں نے گندی بستی کے دلال کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

گندی بستی کے دلال نے اپنی ٹھوڑی کھجا کر کہا۔

''صاحب! اس کھولی کا کرایہ دار کل مر گیا۔''

''تو بہت اچھا ہے۔کھولی خالی ہوگئی۔''

''ہاں خالی ہوگئی صاحب! گندی بستی کادلال اپنی کہنی کھجا کر بولا۔''

مگروہ کرائے دار اپنی طرح ہی ایک گریب مجدور(مزدور) تھااور چوڑیوں کے کھارکھانے (کارخانے) میں کام کرتا تھا!

''مزدور تھاتو کیا ہوا۔آخروہ چوڑیاں بناتا تھاچوریاں تو نہیں کرتا تھا؟''

''نہیں صاب! یہ بات نہیں ہے۔گندی بستی کا دلال اپنی کمر کھجاتے ہوئے بولا۔''

تو چوڑیاں بنانے والامگر دھونکنی دھونکتے دھونکتے اور جلتی ہوئی ریت پھانکتے پھانکتے وہ بیمار ہوگیا۔

''تو اس میں کیا ہے۔ ہر ایک شخص اپنی زندگی میں بیمار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وجہ سے بیمار ہوتا ہے۔چاہے وہ ریت پھانکنے سے بیمار ہو یا زیادہ کھانے سے بیمار ہو!''

''تم سمجھتے نہیں ہو صاب!''

گندی بستی کادلال اپنی ران کھجاتے ہوئے بولا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ اس کو بخار ہوگیا تھا۔جس کو تم تپ دق بولتے ہواور وہ اس کھولی میں پانچ سال بیمار رہااور کام کرتا رہااور اپنے جینے کے لیے لڑتا رہا۔ کیوں کہ اس کے چار بچے تھے اور ایک بیوی تھی۔جب وہ مرگیا تو اس کی بیوی اور بچے یہ کھولی کھالی کر گئے۔''

کیونکہ وہ سولہ روپے کرایہ نہیں دے سکتے تھے۔وہ شہر کے باہر جھونپڑیوں میں

چلے گئے ۔ جہاں اینٹ ڈھونے والے رہتے ہیں ۔اس لیے میں تم کو بولتا ہوں کہ یہ کھولی خالی تو ہے، پر تمہارے لائق نہیں ہے ۔

چھوٹی سی کھولی تھی تاریک دیواریں، چر چراتا ہوا دروازہ، زنگ آلود کنڈی، کھڑکی کی زنگ آلود سلاخیں اور آہنی سلاخوں کے باہر گندی اینٹوں والی موری

میں نے باہر سے نظر ہٹا کر پھر اندر دیکھا تو ایک کونے میں پانی کا نل نظر آیا۔

جس کے منہ پر میلی دھجیاں ٹھونسی گئی تھیں ۔ پھر بھی ان دھجیوں کے آخری سرے سے پانی سبزی مائل فرش پر ترپ ترپ کرکے بہہ رہا تھا۔ جیسے خون بہتا ہو۔

پھر مجھے ایک کونے میں مٹی کا گملا نظر آیا۔ جس میں گلاب کی شاخ پر صرف ایک پھول تھا۔گلاب کا بہت بڑا سرخ پھول ....

''یہ کیا ہے؟''

گندی بستی کا دلال اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستا ہوا بولا۔

''یہ تمہارے لیے ہے صاب''

''میرے لیے؟''

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں صاب!''

دلال نے کہا۔

''مرتے سمے مرنے والے نے کہا تھا۔ جو کوئی میری جگہ اس کمرے میں آئے اسے یہ گملا دے دینا اور اسے بولنا کہ ہر روج (روز) اس کی مٹی میں پانی دے۔

جس سے یہ گلاب کا پودا ہرا رہے۔ پگلا تھا وہ!''

یکا یک میرے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑی اور مجھے کانپتا ہوا چھوڑ گئی۔

میں ان تاریک دیواروں میں گھرے ہوئے اسی گلاب کے پھول کو دیکھنے لگا۔ چاروں طرف گھٹن اور سیلن اور نا امیدی اور یہ پھول۔ اکیلا..................

اندھیرے میں اور گندگی اور بھوک میں اور بدصورتی میں یہ پھول............ ننگی اینٹوں والے طاقچے میں، مکڑی کے لٹکتے ہوئے غلیظ جالوں میں، زنگ آلود آہنی سلاخوں کے درمیان یہ پھول اکیلا............ انسان کے دل میں اگتا ہوا اور انسان کے حوصلے اور بہادری اور عظمت کی طرح سربلند۔ فطرت سے لڑتا ہوا۔ موت پر ہنستا ہوا............ لیکن یہ پھول مرجائے گا۔

ایک دن یہ پھول مرجھا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

اس کھولی کی غلیظ گھٹن اس کی ساری شادابی چوس لے گی۔ یہ تاریکی اس کا رنگ و روپ چھین لے گی۔

اس پر مکڑی کے جالے پھیل جائیں گے اور یہ سیلی ہوئی دیواریں چاروں طرف سے تازہ ہوا روکے رہیں گی۔ اور یہ پھول مرجھا جائے گا۔ جیسے وہ چوڑی والا مزدور مرجھا گیا تھا۔

لیکن یہ پھول زندہ رہے گا!

اور ہر روز لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اگے گا۔ جو چوڑی بناتے ہیں، دفتر جاتے ہیں، کرگھا چلاتے ہیں اور اینٹ پر اینٹ رکھتے ہیں۔ جس طرح

محبت کرنے والا انسان بوسے پر بوسہ رکھتا ہے۔

یہ پھول ہر روز ان انسانوں کے دل میں اگے گا اور زندگی اور اس کی مسلسل جدوجہد کا جادو جگائے گا!

یہ پھول کبھی نہیں مرسکتا۔

میں نے وہی کھولی کرائے پر لے لی ہے..........اور اس دن سے میں وہیں رہتا ہوں!!

تالاب کی حسینہ

پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا۔ چھوٹا سا خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں کی ٹین کی چھتیں، دھوپ میں چاندنی کے تختوں کی طرح چمکتی ہوئی، شوالوں کے رنگین اور روپہلے کلس، سڑکیں جن پر اودے رنگ کی بجری بچھی ہوئی تھی اور جن کے گرد دو رویہ شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے۔ اس کے باغات جو آڑو پلم اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان سب سے مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن کو فروزاں تر کر دیا تھا۔ شمال مغرب کے سلسلہ ہائے کوہ پر ایک ہلکی، لطیف سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ صنوبر، کاؤ اور دیودار کے گھنے درخت اسی سپید دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے قدموں میں یوکلپٹس کے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ ایک لمبے سے کھیت پر سایہ کر رہا تھا کھیت کے درمیان ہل میں جتے ہوئے دو بیل تھے اور اتنی بلندی سے دو خوبصورت کھلونوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان دو بیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے تالاب کے چوکیدار سے کہا۔ ''فیروز بہت افسوس ہے، بہت افسوس ہے، جب ہم نے یہ منحوس خبر سنی جب.......... ہاں پرسوں شام کو ڈاکٹر ساجد کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ فیروز کا لڑکا تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کیا بتاؤں یہ سن کر کتنا رنج ہوا، اسی وجہ سے ہم سب (اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کل یہاں تیرنے کو نہیں آئے تھے۔ ایک دو بار جی میں آیا کہ چلو چلیں، شاید ہماری چند رسمی باتوں سے

تمہارے دل کو کچھ تسکین پہنچ سکے، مگر ہماری طبعتیں ہی کچھ اس طرح افسردہ اور رنجوری ہوگئی تھیں کہ ادھر پاؤں ہی نہ اٹھ سکے۔''

فیروز نے چنار کی ایک ٹہنی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو بابو جی کل میں سوچتا تھا کہ بابو جی کیوں نہیں آئے، میں غریب تو ہوں، مگر پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ ضرور افسوس ظاہر کرنے آئیں گے اور میری ڈھارس بندھائیں گے۔''

جگدیش بولا، ''بس یہی بات تھی (میری طرف اشارہ کرکے) جو انہوں نے بیان کردی۔''

دت نے کہا۔ ''ہاں ہاں، بھلا نہ آنے کی اور کیا وجہ ہوسکتی تھی۔''

سرجیت نے پوچھا۔ ''مگر یہ ہوا کیسے؟''

فیروز نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ''یہ کیوں کر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؟ کس طرح میرا ننھا منا لال آنکھوں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں ابھی تک اس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اسے موت کیونکر آگئی، بھلا یہ بھی کوئی موت ہے، اگر اسے مرنا ہی تھا تو پہلے بیمار ہوتا، میں اس کا علاج کرتا، اسے ڈاکٹروں، حکیموں، عطائیوں، پنساریوں کے پاس اٹھائے پھرتا۔ ان سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا، خدارا میرے بچے کا اچھی طرح علاج کرو۔ ہم دونوں میاں بیوی بیماری کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹتے۔ سارا دن اس کے سرہانے بیٹھے رہتے، اس کی ذرا ذرا سی فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، وہ کتنے ہی دنوں سے ربڑ کا کھلونا مانگ رہا تھا۔ ہائے میں نے اسے کیوں نہ لا کر دیا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگلی

تنخواہ کے آنے پر تجھے لا دوں گا۔ کیا پتہ تھا کہ جب اگلی تنخواہ آئے گی، میرا بیٹا کھلونا مانگنے کے لیے یہاں موجود نہ ہوگا۔ دل چاہتا ہے، میں ربڑ کا کھلونا جو اسے اس قدر پسند تھا۔ خرید لوں اور اپنے بیٹے کی قبر پر جا کر رکھ دوں اور اس سے کہوں اٹھو، بیٹا منظور، تمہارا باپ تمہارے لیے ربڑ کا پیارا سا کھلونا لایا ہے۔ کیا وہ میری بات سنے گا بابو جی؟''

ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے............ہم نے جلدی سے کپڑے اتارے اور غسل کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

سرجیت بولا، ''کے سال کا تھا منظور، یہی دو، ڈھائی، تین سال کا ہوگا، چھوٹا سا تو تھا ہی!''

فیروز بولا۔ ''ہاں بابو جی، بس اتنی ہی عمر کا ہوگا۔ مگر کتنا پیارا بچہ تھا، آپ نے دیکھا تھا نا سانولا رنگ، موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، اس کی ماں سعیدہ نے اسے کتنی تکلیفوں سے پایا تھا، کتنے ہی پیروں، فقیروں سے گنڈے تعویذ لیے، منتیں مانی، تب جا کر گھر کا لال ہاتھ آیا۔ یہ پتہ نہ تھا اتنی جلدی ہمیں جدائی کا داغ دے جائے گا، بس حیرت ہے تو یہی، ایمان سے کہتا ہوں، بابو جی میرے کلیجے میں بس یہی ناسور ہے، وہ بیمار ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے کمزور ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی جھولی میں جان دیتا۔ پھر میں اسے کفناتا، دفناتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا مگر یہ کیا ہوا کہ میں یہاں (تالاب کے عین اوپر ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے) اپنے مکان کے صحن میں کھڑا دور نیچے پگڈنڈی پر جاتے ہوئے ان خوش باش بے فکر نوجوانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو گاتے، ناچتے ہوئے بساکھی

کے میلہ پر جا رہے تھے۔ یہاں، تالاب میں غربی سمت پر چند سکھ لڑکے نہا رہے تھے، ادھر دوسری طرف چند عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ منظور کی ماں سعیدہ صحن میں چولھے پر مکی کی روٹیاں پکا رہی تھی۔ منظور اسی کے پاس کھڑا توتلی آواز میں کہہ رہا تھا، اماں آنی، اماں اوتی، سعیدہ کی ماں کھاٹ پر چائے پی رہی تھی، پھر پتہ نہیں کس وقت منظور اپنی ماں کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ کپڑے دھوتی ہوئی عورتوں کی چھوا چھو، نہاتے ہوئے سکھ لڑکوں کے قہقہے، بساکھی کے میلہ کو جاتے ہوے جاتریوں کا شور وغل بس ہم نے ان چند منٹوں کے لیے منظور کو اپنے دل سے بھلا دیا، کچھ دیر بعد میں نے تالاب کے کنارے سے کسی کو کہتے سنا، وہ لکڑی سی کیس تیر رہی ہے، اس کے بعد، ارے پھر.......... یہ تو کسی کی لات ہے۔'' پھر کسی نے کہا کہ ''بچہ!'' میں بھاگتا ہوا کنارے کی طرف گیا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں چھو کر کہا۔ ''مر گیا ہے۔'' (چھاتی پر دوہتڑ مر کر) ہائے!! جگدیش۔ صبر کرو فیروز صبر کرو!

فیروز، بابو جی صبر کروں تو کیسے، آنکھوں کے آگے اس کی بھولی بھالی صورت ہے۔ اب ہمارے لیے اس کی یاد کے سوا اور کیا رہ گیا ہے (جیب میں ہاتھ ڈال دیتا ہے) اور یا یہ.......... (جیب سے ہاتھ نکال کر).......... یہ پتلی سی مسواک۔ یہ مسواک اور ایک چھوٹی سی مٹی کی پیالی، میں نے یہ دونوں چیزیں اس چھوٹی سی نہر کے کنارے پائیں جو اس تالاب کو پانی مہیا کرتی ہے۔ وہ صحن سے اتر کر نہر کی ان سیڑھیوں کی طرف آیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اس نے جھک کر مٹی کی پیالی میں پانی بھرا ہوگا۔ مسواک کو زمین پر رکھ کر اس نہر میں ہاتھ ڈال کر پانی سے کلی کرنے کی کوشش کی ہوگی، پھر وہ یکا یک پھسل گیا ہوگا۔ پانی میں ہلکا شور بھی پیدا

ہوا ہو گا۔ اس نے چیخنے کی کوشش بھی کی ہو گی۔ تالاب کے کنارے تک جاتے جاتے اس نے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہوں گے، مگر آہ میری آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ کانوں نے سنا، سوا ان گیتوں کے جو راہگیر گا رہے تھے، سعیدہ روٹی پکاتی رہی، بڑی اماں کھاٹ پر چائے پیتی رہیں اور اس نہر کے کنارے ہمارے آنکھوں کے سامنے.......... ہائے.......... بابو جی، صبر کیسے آئے؟

سرجیت۔ یہ مشیت ایزدی تھی، اس میں کسی کا کیا دخل، خدا نے تمہیں دیا، اسی نے لے لیا۔ تمہارا اس پر اتنا ہی حق تھا۔

فیروز۔ سچ ہے بابو جی، انسان کیا کر سکتا ہے؟

دت۔ کیسا پیارا بچہ تھا، جگدیش، تمہیں یاد ہے وہ دن، وہ اس نہر کے کنارے اپنی چھوٹی سی قمیض دھو رہا تھا، کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا، یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا، اس وقت کیمرہ ہوتا تو اس کی تصویر کھینچ لیتے اور انعامی مقابلے کے لیے بھیجتے۔

سعیدہ جواب تک پاس کھڑی چپ چاپ سب باتیں سن رہی تھی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بابو جی، کنور لوک ناتھ سنگھ جی جو ڈاک بنگلے کے قریب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں انہوں نے ایک بار منظور کی تصویر کھینچی تھی۔ ہم نے کئی بار ان سے وہ تصویر مانگی ہے مگر وہ دیتے نہیں اگر آپ ان سے کہیں تو..........''

جگ دیش بولا۔ بہت اچھا سعیدہ، میں ضرور ان سے کہوں گا، امید ہے وہ تصویر دے دیں گے۔

اب ہم غسل کا لباس پہن کر تالاب کے کنارے پہنچ چکے تھے، تالاب کی وسیع

چادر آب ہمارے سامنے تھی۔ جس پر کہیں نیلوفر کے پھول کھلے ہوئے تھے، میں ہاتھ پھیلا کر ایڑیاں اٹھا کر غوطہ زن ہونے کو تھا کہ سرجیت نے آہستہ سے میری کان میں انگریزی زبان میں کہا ''پیچھے دیکھو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ چنار کے درخت کے قریب، جنگلی گلاب کی بیلوں کے درمیان ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سرو کی طرح خوش قامت اور جنگلی گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت اور نازک اندام، اس کی دونوں کلائیاں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور سر پر رکھی ہوئی مٹی کی گاگر کو تھامے ہوئے تھیں۔ سعیدہ اس کے پاس کھڑی اشاروں میں اسے کچھ کہہ رہی تھی وہ کتنی نازک کتنی خوبصورت تھی۔ بانکے، ترچھے، دلآویز نقش، کیا ایک عورت بھی اس قدر حسین ہوسکتی ہے۔ مجھے احساس ہوا، یہ عورت نہیں چغتائی کی ایک تصویر ہے۔

میں نے سرجیت سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

سرجیت نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں جانتے، یہ کون ہے؟ حیرت ہے یہ ایک کمہاری ہے اوپر سے تالاب کے اس پار (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ جو گھر ہے نا۔ کچا سا، وہاں رہتی ہے۔ سب جج صاحب کا لڑکا جو یہاں نہانے کے لیے آیا کرتا ہے۔ اس نے اس کا نام ''تالاب کی حسینہ'' رکھ دیا ہے۔''

''تالاب کی حسینہ.......... تالاب کی حسینہ..........'' میں نے دہراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو یہ سعیدہ اسے کیسے اشارے کر رہی ہے۔''

''بچاری غریب لڑکی گونگی ہے نا۔''

''اوہ''.......... میں نے آہستہ سے کہا۔ ''یکا یک میرے دل میں خیال آیا، یہ لڑکی گونگی ہے تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے۔ اگر تصویر، خاموش تصویر بول اٹھے تو اس کی آدھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دنیا کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں۔''

ہم سب کی نظریں اپنی طرف گڑی دیکھ کر وہ لڑکی حیران سی ہو گئی، اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرنیوں والی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، وہ گھبرا کر ٹھٹک سی گئی، اس نے اپنا رخ ہماری طرف پھیر لیا۔ کانوں میں پڑے ہوئے موتیا کے آویزے یکا یک سورج کی کرنوں میں چمک اٹھے۔ اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سر کو خفیف سی جنبش دی، مٹی کی گاگر میں اک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا۔ پاؤں کی جھانجھیں بجنے لگیں۔ ساکن تصویر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر سے نیچے اترنے لگی۔

میں نے یکا یک کہا۔ ''تم جانتے ہو سرجیت! ہندوستانی رقص کی ایجاد کیسے ہوئی؟''

''نہیں، کیوں؟''

میں نے پگڈنڈی پر سے نیچے اترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''وہ دیکھو، ایک مٹی کی گاگر اٹھائے دوشیزہ، اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی روپہلی جھانجھیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا اور انتہا ہے۔''

جگدیش نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم اس غریب لڑکی کو نگاہوں سے نگل جاؤ گے، کیسی گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہو، اب نہاتے بھی ہو کہ دوں میں

تمہیں پانی میں ایک غوطہ۔''

اتنا کہہ کر جگدیش نے شانے پھیلا کر، ایڑیاں اٹھا کر، ہوا میں ابابیل کی طرح ایک زقند بھری اور دوسرے لمحہ میں وہ پانی میں دھم سے غوطہ زن ہو گیا۔

اس کے بعد دھم، دھم، دھم ہم سب پانی میں کود پڑے اور فضا بلند قہقہوں سے معمور ہو گئی۔ سطح آب پر بازوؤں کے تیز تیز چپو چل رہے تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھالا جا رہا تھا، نیلوفر کے پھول توڑ توڑ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکے جا رہے تھے۔ دت بار بار منہ میں پانی بھر کر زور سے کلیاں کرتا تھا، سرجیت کو تیرنا کم آتا تھا۔ اس لیے وہ سب سے الگ تھلگ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی مشق بہم پہنچا رہا تھا، جگدیش اس کے قریب گیا اور اس کے سر کو اپنے بازوؤں میں تھام کر پیار سے بولا۔ ''وایں دفتر بے معنی (ایک ڈبکی لے کر) غرق مے ناب اولے'' سرجیت چلانے لگا۔ کنارے پر فیروز کھڑا افسردہ نگاہوں سے تالاب کے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فیروز کی اداس نگاہیں میرے دل میں ایک عجیب خلش پیدا کر رہی تھیں، تیرتے تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں تالاب میں ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا۔ یہاں ہنسی کی لہریں ہیں اور موت کے چھینٹے بھی اور پھر کبھی کبھی کوئی خوبصورت کمہاری............

تائی ایسری

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹر کا فائنل کورس کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کے لیے لاہور آ گیا تھا۔ یہیں شاہی محلے کے قریب کوچہ ٹھاکر داس میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا میری ملاقات پہلی بار تائی ایسری سے ہوئی............

تائی ایسری ہماری سگی تائی تو نہ تھی لیکن ایسی تھیں کہ انہیں دیکھ کر ہر ایک کا جی انہیں تائی کہنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا .... محلے کے باہر جب ان کا تانگہ آ کے رکا اور کسی نے کہا۔ ''لو تائی ایسری آ گئیں۔'' تو بہت سے بوڑھے، جوان مرد اور عورتیں انہیں لینے کے لیے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دیکر تائی ایسری کو تانگے سے نیچے اتارا، کیونکہ تائی ایسری فربہ اندام تھی اور چلنے سے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے ہی سے ان کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتے داروں نے یکبارگی اپنی جیب سے تانگے کے کرائے کے پیسے نکالے۔ مگر تائی ایسری نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وہ تو پہلے ہی تانگے والے کو کرائے کے پیسے دے چکی ہے اور جب وہ یوں اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان باتیں کرتے کرتے ہنسیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ دو تین رشتے داروں کا چہرہ اتر گیا اور انہوں نے پیسے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا تائی'' ہمیں اتنی سی خدمت کا موقع بھی نہیں دیتی ہو! اس پر تائی نے کچھ جواب نہیں دیا انہوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان

عورت سے پنکھی لے لی اور اسے جھلتے ہوئے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

تائی ایسری کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ ان کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے اور ان کے بھرے بھرے گول مٹول چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا پھولی پھولی سانسوں میں معصوم باتیں کرنا تو سب کو اچھا لگتا ہی تھا، لیکن مجھے ان کے چہرے میں ان کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے۔ کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادر آب کا خیال آیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان آنکھوں کے اندر جو محبت ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں، جو معصومیت ہے، اس کی کوئی تھاہ نہیں، جو درد ہے اس کا کوئی درماں نہیں۔

میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں، جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں، کہ زندگی کو بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی ان کے لیے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے۔ ایسی آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب بہا کر لے جائیں۔ ایسی انوکھی معاف کر دینے والی، درگزر کرنے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔

تائی ایسری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا جس پر سنہری گوٹے کا لہریا چمک رہا تھا۔ ان کی قمیض بسنتی ریشم کی تھی۔ جس پر زری کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہری ململ کا قرمزی دوپٹا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گوکھرو تھے۔ جب وہ گھر کر دالان میں داخل ہوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں، خالائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی ایسری کے پاؤں

چھونے کو دوڑیں، ایک عورت نے جلدی سے ایک لین پیڑھی کھینچ کرتائی ایسری کے لیے رکھ دی اور تائی ایسری ہنستے ہوئے اس پر بیٹھ گئیں اور ری باری سے سب کو گلے کر سب کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں۔

اوران کے قریب ہیرومہری کی بیٹی سوتری خوشی سے باچھیں کھلائے زور زور سے پنکھا جھل رہی تھی۔ تائی ایسری گھر سے رنگین پچھی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھی۔ جوان کے قدموں میں ان کی پیڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سب کو دعائیں دیتی جاتیں اور پچھی والی ٹوکری کھول کر اس میں سے ایک چونی نکال کر دیتی جاتیں۔ کوئی ایک سو چونیاں انھوں نے اگلے بیس منٹ میں بانٹ دیں۔ جب سب عورتیں اور مرد، لڑکے اور بچے بالے ان کے پاؤں چھو کر اپنی اپنی چونی لے چکے تو انہوں نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا۔

''تو کون ہے؟''

''میں سوتری ہوں۔''

''آئے ہائے تو جے کرشن کی لڑکی ہے؟ میں تو بھول ہی گئی تھی تجھے۔ آ جا گلے سے لگ جا...........''

تائی ایسری نے اسے گلے سے لگا لیا۔ بلکہ اس کا منہ بھی چوم لیا اور جب انہوں نے اپنی پچھی والی ٹوکری سے چونی دی تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور موسی کرتا روا اپنی نیلم کی انگوٹھی والی انگلی نچا کر بولی۔

''تائی یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے۔ یہ تو ہیرومہری کی بیٹی سوتری

ہے!''

''ہائے میں مرگئی!'' تائی ایسری ایک دم گھبرا کر بولیں اور ان کی سانس پھول گئی۔''ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا۔ میں نے تو اس کا منہ چوم لیا ہے۔ اب کیا کروں؟''

تائی ایسری نے بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا جو اب اس طرح دھتکارے جانے سے سسکنے لگی تھی۔ یکا یک تائی کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے پھر اس یبانہہ سے پکڑ کر چمٹا لیا............ ناں! ناں تو کیوں روتی ہے، تو تو انجان ہے۔ تو تو دیوی ہے۔ تو تو کنواری ہے۔ تیرے من میں تو پرمیسر بستے ہیں۔ تو کیوں روتی ہے، مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا پڑے گا۔ پر تو کیوں روتی ہے؟ لے ایک چونی اور لے...........

تائی ایسری نے اسے دوسری چونٹی دی۔ دوسری چونی پا کر مہری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ تائی ایسری نے ایک بازو اٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو مہری کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''نی ہیرو۔ میرے اشنان کے لیے بھی پانی رکھ دے۔ تجھے بھی ایک چونی دوں گی!''

اس پر ساری محفل پھر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

تائی ایسری کو کئی لوگ چونی والی تائی کہتے تھے۔ کئی لوگ کنواری تائی کہتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی ایسری سے شادی کی تھی اس دن سے آج تک وہ کنواری کی کنواری چلی آ رہی تھیں۔ کیونکہ

سنانے والے تو یہ بھی سناتے ہیں کہ تایا یودھ راج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورتیں دیکھ ڈالی تھیں کہ جب ان کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ انہیں بالکل پسند نہ آئیں، جب سے انہوں نے شادی کر کے انہیں بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر کسی طرح کی سختی نہیں کیا کرتے تھے۔ تایا یودھ راج ہر ماہ پچھتر روپے اسے بھیجتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتی تھی۔ اپنے سسرال کے ہاں.........اور سب کی خدمت کرتی تھیں۔ اور تایا یودھ راج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے تھے۔ میکے والوں نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ میکے والوں نے بھی چاہا کہ ان کی شادی پھر سے کر دی جائے۔ مگر تائی اس کے لیے بھی راضی نہ ہوئیں۔ وہ ایسے انہاک سے اپنے سسرال والوں کی خدمت کرتی رہیں کہ سسرال والے خود اسے اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے۔ تایا یودھ راج کے باپ مالک چند نے تو اپنے گھر کی ساری چابیاں تائی ایسری کے سپرد کر دی تھیں اور ساس بھی اس حد تک چاہنے لگی تھیں کہ انہوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی ایسری کی تحویل رہی ہوں گی؟ مگر تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہ آیا۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ تائی ایسری شاید بچپن سے، بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے اپنے پتی کو ہاتھ پھیلا کر آشیرباد دی ہوگی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو.........

تجھے میرے لیے بہت دکھ اٹھانے پڑے اس لیے یہ لیجیے ایک چونی!
شاید اسی لیے شوہر سے بھی ان کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ تایا یودھ راج

ہمارے رشتے داروں کی نظر میں شرابی کبابی اور رنڈی باز تھے۔ وہ لوہے کے بڑے بیوپاری تھے تو کیا ہوا؟ انہیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد کرنا نہ چاہیے۔ مگر جانے کیا بات تھی تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے ان کی زندگی برباد کی ہے......... ہر وقت ہنستی، کھیلتی باتیں کرتی، ہر ایک کے سکھ اور دکھ میں شامل ہونے اور خدمت کرنے کے لیے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وہ اس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وہ اس میں حصہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے۔ مگر وہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتر روپے جو انہیں ماہوار ملتے تھے وہ انہیں ہمیشہ دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ مگر وہ سستے زمانے کے پچھتر روپے تھے۔ اسی لیے بہت سے لوگوں کے دکھ دور دور ہو جاتے تھے۔ مگر لوگ ان سے ان کی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ ایسے بہت ہی بہت سے موقعے آئے تھے جب تائی ایسری کی جیب میں چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی یہ لوگ بے مزہ نہ ہوئے بلکہ یہی کہتے سنے گئے کہ تائی ایسری کے تو چرن چھو لینے سے دل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھی تایا یودھ راج اتنے ہی برے تھے۔ تین برس تک تو انہوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر گاؤں ہی میں رکھا اور جب ان کے ماں اور باپ دونوں ہی مر گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دوسرے افراد بڑے ہو گئے اور شادیاں کر کے اور اپنے گھر بسا کے دوسری جگہوں پر چلے گئے تو

انہیں بادلِ نخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا۔ مگر یہاں تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں کیونکہ پکا باغ کے معزز پٹھانوں کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی نتیجے میں انہیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا۔ کیونکہ پکا باغ کے پٹھانوں نے آ کر تائی ایسری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری وجہ سے ہم نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ۔ ورنہ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے اور تائی ایسری اس واقعہ کے چند دنوں بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آ گئیں۔ محلّہ ونجاراں میں انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ راج کا بیوپار چند مہینوں ہی میں چمک گیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے شاہی محلے کی ایک طوائف چھمی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصہ یہاں تک بڑھا کہ اب انہوں نے مستقل طور پر اسی چھمی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا اور محلّہ ونجاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے۔ لیکن تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس امر کا اتنا سا بھی ملال ہوا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب تایا یودھ راج اور اس طوائف کا قصہ زوروں پر تھا۔ انہیں دنوں ہمارے بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔ شادی میں تایا یودھ راج تو شریک نہ ہوئے لیکن تائی ایسری نے رشتے داروں، مہمانوں اور برات کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔ ان کی خوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئیں۔ چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منور ہوتی گئیں۔ اس میں تائی کی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔ سکون کی شعاعیں گویا

خود بخو دان کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔انہیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غصہ اتر جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ الجھنیں خود بخود سلجھ جاتیں گھر بھر میں بشاشت بکھر جاتی، ایسی تھیں تائی ایسری!

میں نے تائی ایسری کو کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔کبھی رنجور یا اداس نہیں دیکھا۔ہاں ایک بار ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ بھی اسی شادی سے متعلق ہے۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیدی پر بیٹھے رہے۔صبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کے سجا دیا۔پرانے زمانے تھے وہ۔اس زمانے میں صوفوں کی بجائے رنگین پیڑھیاں دی جاتی تھیں اور منقش پایوں والے پلنگ دیئے جاتے تھے۔اس زمانے میں ڈرائینگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔میرے بڑے بھائی کے سسر ملٹری میں ایگزیکٹو آفیسر تھے، چونکہ وہ پہلے ہندوستانی ایگزیکٹو آفیسر تھے اس لیے انہوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دی تھیں۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔دور دور کے محلوں سے بھی عورتیں ''انگریزی پیڑھیوں'' کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔تائی ایسری کے لیے بھی صوفہ سیٹ دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔اس پر ہاتھ پھیر کر بار بار من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہیں آخر ان سے رہا نہ گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''وے کاکا۔اس کو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟''

اب میں اس کا جواب کیا دیتا۔ سر ہلا کر کہنے لگا۔

''مجھے نہیں معلوم تائی!''

''اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟''

میں پھر لاجواب ہو گیا۔ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکا یک جیسے ان کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ ان کا چہرہ ان کی معصوم مسکراہٹ سے روشن ہو اٹھا۔ بولیں، میں بتاؤں؟

میں نے کہا............''بتاؤ تائی!''

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں............''دیکھو میرا خیال ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لیے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریز بڑے عقل مند ہوتے ہیں۔ جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں!''

تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ مگر میں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر کچھ چپ سی رہ گئیں، کیا اس وقت انہیں اپنا اور اپنے خاندان کا جھگڑا یاد آیا تھا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے جب غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لیے مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو!

کلکتے سے ایم۔بی۔بی ایس کرنے کے بعد میں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔چنانچہ اپنے بڑے بھائی صاحب کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکرداس کے نکڑ پر مجھے دوکان کھول دی اور میں اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں، اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔کلکتے میں، میں بالکل اناڑی تھا،نوجوان تھا اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔یہاں آکر آٹھ دس برسوں میں گاہک پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خودبخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔بچے بھی آ گئے تھے۔اس لیے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار میں چکر کھانے لگی۔ادھرادھر جانے کا موقع کم ملتا تھا۔اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا منہ نہ دیکھا تھا۔مگر اتنا سن رکھا تھا کہ تائی ایسری اسی مکان میں محلّہ ونجاراں میں رہتی ہیں۔اور تایا یودھ راج شاہی محلے میں اس پچھی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے تیسرے مہینے تائی ایسری کی خبر لینے آ جاتے ہیں۔

ایک روز میں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلّہ ونجاراں کے ایک آدمی نے آ کر کہا۔''جلدی چلیے ڈاکٹر صاحب۔تائی ایسری مر رہی ہے۔''

میں اسی وقت تمام کام چھوڑ کر اس آدمی کے ساتھ ہولیا۔محلّہ ونجاراں کے بالکل اس آخری سرے پر تائی کا مکان تھا۔پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب میں آہنی سلاخوں والے موکھے سے گزر کر ان کے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا

تو وہ بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لیے پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور انہوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دل کو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولے پھولے سانسوں میں مسکرانے لگیں۔ بولیں۔ ''تو آ گیا پتر! اب میں بچ جاؤں گی!''

''کیا تکلیف ہو گئی تائی؟''

''ہوتا کیا موت کا بلاوا آ گیا تھا۔ دو دن سے مجھے سخت کس رہی (بخار) پھر ایکا ایکی جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔'' (بیان کرتے کرتے تائی کی پتلیاں پھیلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی، ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤں تو ٹھنڈی یخ، چٹکی بھروں تو کچھ محسوس نہ ہو۔ پھر دھیرے دھیرے میری جان کمرے سے بھی نکل گئی اور جب میری جان اوپر سے نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا'' تائی اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف اپنے دل والے حصے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں۔ تو میں نے زور سے کلیجے کو پکڑ لیا اور چلائی۔ ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے تو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بلا کر لائے۔ وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے!.......... اب تم آ گئے ہو اب.......... اب میں بچ جاؤں گی۔!..........'' تائی ایسری نے مکمل طمانت سے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تائی ذرا اپنا یہ ہاتھ ادھر کرو۔ میں تمہاری نبض تو دیکھوں؟

اک دم تائی دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ ہائے وے! تم کیسے ڈاکٹر ہو؟ تجھے اتنا معلوم نہیں کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے۔

اس ہاتھ کی نبض تجھ کو کیسے دکھا سکتی ہوں؟

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہو گئیں ۔انہیں تو بلڈ پریشر کی شکایت تھی ۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اٹھ کر گھومنے لگیں اور اپنے پرائے سب کے سکھ دکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں ۔لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہوا۔ وہیں پھپھی کے گھر شاہی محلے میں ان کا ہارٹ فیل ہوا۔ وہیں سے ارتھی اٹھی ۔ کیونکہ تائی نے ان کی لاش کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی تھی ۔تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں نہ انہوں نے شمشان گھاٹ کا رخ کیا۔ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں ۔ رنگین کپڑے اتار کر سپید دھوتی پہن لی اور اپنے ماتھے کا سیندور پونچھ کر چولھے کی راکھ ماتھے پر لگالی ۔مگر ان کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھوتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں ۔تائی کی اس حرکت پر برادری میں چہ مگوئیاں ہوئیں ۔ سب کو اچنبھا ہوا۔ کچھ لوگوں نے برا بھی مانا ۔مگر تائی کی عزت اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی!

چند برس اور گزر گئے ۔اب میری پریکٹس اس قدر چمک اٹھی تھی کہ میں نے محلّہ ٹھاکر داس کے علاوہ شاہ عالمی گیٹ کے اندر کوچہ کرماں اور وچھو والی کے چوک میں بھی پریکٹس شروع کر دی تھی ۔صبح میں محلّہ ٹھاکر داس میں بیٹھتا تھا، شام کو وچھو والی میں ۔ زندگی کچھ اس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی ایسری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو برس گزر جاتے تھے ۔مگر گھر کی عورتوں سے تائی ایسری کی خیریت کی خبر

ماتی رہتی تھی۔تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا سارا روپیہ تو پھپھی کو سونپ دیا تھا مگر جالندھر کی دکان اور مکان تائی ایسری کو ڈیڑھ سو روپیہ کا کرایہ آ جاتا تھا۔وہ بدستور اسی طرح محلّہ ونجاں میں رہتی تھیں اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آ گئی اور ان کی یاد سے پھپھی کی یاد آ گئی۔کیونکہ پھپھی بھی تو اسی شاہی محلے میں کہیں رہتی تھی اور جب پھپھی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی ایسری کی طرف منتقل ہو گیا اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی ایسری کو دیکھنے نہ گیا تھا۔میں نے سوچا میں کل یا پرسوں پہلی فرصت ہی میں تائی ایسری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی ایسری کو نکلتے دیکھا۔قرمزی شاہی کے بجائے اب وہ سیاہ شاہی کا گھا گھرا پہنے تھیں۔جس پر نہ گوٹا تھا نہ لچکا قمیض بھی سفید رنگ کی تھی اور سر پر انہوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹا لے رکھا تھا۔جس میں ان کا گول مٹول چہرہ بالکل میڈونا کی طرح معصوم اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔

جس لمحے میں نے انہیں دیکھا۔اسی لمحے انہوں نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی شرما گئیں اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں۔کہ میں نے انہیں فوراً آواز دے دی۔میری آواز میں ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔یہ تائی ایسری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں؟

''تائی ایسری''میں نے چلا کر کہا۔''تائی ایسری!!''میں نے پھر آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ پلٹ آئیں۔سامنے آ کر ایک گناہ گار مجرم کی طرح کھڑی ہوگئیں۔ان کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔

''تائی تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''میں نے کچھ حیرت سے کچھ غصے سے ان سے کہا

وہ اسی طرح سر نیچا کر کے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔''رے پتر! کیا بتاؤں،وو............وہ............میں نے سنا تھا پچھی بیمار ہے۔بہت سخت بیمار ہے، میں نے سوچا اسے دیکھ آؤں............!''

''تم یہاں پچھی کو دیکھنے آئی تھیں؟''میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔ پچھی کو............پچھی کو............اس بدذات چھنال کو؟............جس نے............جس نے............!

تائی ایسری نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں کہتے کہتے رک گیا۔

''ناں کاکا! اسکو کچھ نہ کہو............''تائی ایسری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں............''مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی۔آج وہ بھی چل بسی!!''

۴۷ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ کیونکہ یہاں پر تائی ایسری کا گھر تھا۔خاصہ کھلا دومنزلہ مکان تھا۔اوپر کی منزل انھوں نے اپنے رشتے دار پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھی۔نچلی منزل میں وہ خود رہتی تھیں۔ہر روز وہ رفیو جی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں اور کبھی کبھار دو ایک یتیم

بچے اٹھا لاتیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں انہوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ کیونکہ ان کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پچھواڑے کے آنگن اور سامنے کے دالان میں بھی انہوں نے مختلف پناگزینوں کو سونے اور کھانے پکانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوتے ہوتے اچھا خاصا گھر سرائے میں تبدیل ہو گیا۔ مگر میں نے تائی ایسری کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اس طرح آتی تھیں جیسے وہ گھر ان کا نہ ہو۔ ان پناہ گزینوں کا ہو جنہیں انہوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے مگر میں عورتوں میں تو کیا مردوں میں ایسا کوہی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہو گا۔ جسے تائی ایسری کی طرح شخصی جائیداد کا اس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے ان کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لیے وقف تھا۔ جالندھر آ کر وہ صرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ میں ان کی ان حرکتوں سے بہت چڑتا تھا کیونکہ میں اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھو دی تھی۔ میری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی اور میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ روپیہ پیسہ تھا۔ نہ کھانا پینا تک کا ہو سکتا تھا۔ جو ملا کھا لیا۔ جب ملا کھا لیا۔ نہ ملا تو بھوکے رہ گئے۔ انہیں دونوں مجھے خونی بواسیر لاحق ہو گئی۔ دوائیں تو میں نے طرح طرح کی استعمال کیں کیونکہ میں خود ڈاکٹر تھا۔ مگر اس بے سروسامانی میں اس علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے۔ وہ کہاں سے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا۔ کچھ دن تک تو میں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا مگر

ایک دن انہیں پتہ چل ہی گیا۔فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنی لگیں.......... کاکا میں تم سے کہتی ہوں کہ یہ خونی بواسیر ہے۔ یہ ڈاکٹری علاج سے ٹھیک نہ ہوگی۔تم ایسا کرو کرایہ مجھ سے لےلو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ۔وہاں محلّہ سنیاریاں میں چاچا کریم بخش جراح رہتا ہے۔اس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے۔جس سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔تیرے تایا کو آج سے بیس سال پہلے یہ تکلیف ہوگئی تھی اور اسے چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔دس دن میں وہ ٹھیک ہو کر گوجرانوالہ سے واپس جالندھر آ گئے تھے۔

یہ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا۔تائی مجھے معلوم ہے اب میں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا۔

''کیوں نہیں جا سکتا؟ ٹکٹ کے پیسے میں دیتی ہوں!''

''سوال ٹکٹ کا نہیں ہے۔گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے۔''

''پاکستان میں ہے تو کیا ہوا؟ کیا ہم دوا دارو کے لیے بھی وہاں نہیں جا سکتے! وہاں اپنا چاچا کریم بخش............''

میں نے تائی کی بات کاٹ کر کہا۔''تائی تجھے کچھ معلوم تو ہے نہیں۔خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے۔اس کا نام پاکستان ہے ہمارے دیس کا نام ہندوستان ہے۔ اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں، نہ پاکستان والے یہاں آ سکتے ہیں۔ اس کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی۔''

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔بولیں۔''پاس کورٹ؟........... کیا اس کے

لیے کچہری جانا پڑتا ہے؟''

''ہاں اس کے لیے کچہری ہی جانا پڑتا ہے!'' میں نے جلدی سے ٹالنے کے لیے کہہ دیا اب اس بڈھی کو کون سمجھائے۔

نہ بیٹا کورٹ جانا تو اچھا نہیں ہے۔ شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے۔ مگر وہ چاچا کریم بخش..........!

''بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش۔'' میں نے چلا کر کہا

''بیس برس پہلے کی بات کرتی ہو۔ جانے وہ تمہارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے کہ مر گیا۔ مگر تم وہی اپنا چاچا کریم بخش رٹے جا رہی ہو۔''

تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنگ مزاجی پر بے حد افسوس ہوا۔ کیوں میں نے اس معصوم عورت کا دل دکھایا۔ اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

میں دراصل ان دنوں بہت ہی تلخ مزاج ہو چلا تھا۔ کالج کے دنوں میں اکثر انقلاب کی باتیں کیا کرتا تھا۔ پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی اور میری پریکٹس چلی نکلی تو انقلاب کا جوش سرد پڑ گیا اور ہوتے ہوتے یہ لفظ ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب جالندھر آ کر جو افتاد پڑی تو میرے دل میں پھر سے انقلاب کے خیال نے کروٹ لی اور میں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لٹے پٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اسی تلخی، تیزی اور تندہی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔ یہ سب لوگ اکثر تائی ایسری کی دوسری منزل میں میرے کمرے میں ملتے،

چائے کا دور چلتا اور ادنیا جہاں کی باتیں ہوتیں اور میں جوش سے اپنا مکا ہوا میں لہرا کر کہتا۔ ''ہم سے انصاف نہیں ہو رہا ہے اور ان لوگوں سے انصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس ملک میں پھر ایک انقلاب آئے گا اور ضرور آ کے رہے گا وہ انقلاب!''

ایک دن تائی ایسری نے ہماری باتیں سن لیں۔ تو گھبرائی گھبرائی اندر آئیں۔ بولیں۔

''بیٹا۔ کیا مسلمان یہاں پھر آئیں گے؟''

''نہیں تائی۔ تم سے یہ کس نے کہا؟''

''تو تم یہاں کس ''انقلاب'' کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں آئے گا؟''

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا! جب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی تو ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''کتنی بھولی ہے ہماری تائی، اری تائی ہم تو اس انقلاب کا ذکر کر رہے ہیں جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان ہے۔ جو سب کا انقلاب ہے ہم تو اس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں۔''

مگر تائی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں۔

''اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں!''

تائی نے میری مدد کرنے کے لیے سولہ تولے کا ایک گوکھرو بیچ دیا اس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا۔ کیونکہ جالندھر میں بے حد افراتفری تھی اور غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر پریکٹس شروع

کر دی۔ چند سالوں ہی میں میری پریکٹس پھر چمک اٹھی ۔ میں قرولباغ میں پریکٹس کرتا تھا اور قرولباغ لاہور کے بہت سے رفیوجیوں سے بھرا پڑا تھا جو مجھے جانتے تھے۔ ہولے ہولے میں نے اپنا اڈہ ٹھیک سے جمالیا۔ پریکٹس چمک اٹھی۔ دس سال میں، میں نے قرولباغ میں اپنی ایک کوٹھی کھڑی کر لی ۔ گاڑی بھی خرید لی۔ اب قرولباغ کے سرکردہ افراد میں میرا شمار ہوتا ہے۔ اب میں انقلاب کی باتیں بھول گیا ہوں۔ میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہوگئی ہے اور تلخی کے بجائے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی ۔ جو ایک ڈاکٹر کے مزاج کے لیے بے حد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گزشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصے میں، میں تائی ایسری کو بالکل بھول گیا تھا۔ رشتے دار تو اس وقت یاد آتے ہیں جب مریض نہ ہوں لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری کی یاد آئی۔ ان کے احسانات یاد آئے۔ وہ سونے کا گوکھرو یاد آیا جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی۔ وہ رقم میں نے آج تک تائی ایسری کو ادا نہیں کی تھی ۔ جالندھر اسٹیشن پر اترتے ہی میں سیدھا تائی ایسری کے گھر چلا گیا............

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہوا ایندھن کے دھوئیں، تیل کی بو اور گھر آتے واپس آتے ہوئے بچوں کی آوازوں سے معمور تھی ۔ جب میں تائی ایسری کے مکان کی نچلی منزل میں داخل ہوا۔

گھر میں اس وقت تائی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلائے، پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی

تھیں۔ جب کہ انہوں نے میری آہٹ پا کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' میں نے کمرے میں دو قدم آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بے حد نحیف اور نزار ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی دبلا ہو گیا تھا اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھیں۔

''میں رادھا کشن ہوں۔''

''جے کشن کا کا؟'' تائی کی آواز بھرا گئی۔ ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں مگر میں نے انہیں جلدی سے تھام لیا اور وہ میرے بازو سے لگ کر رونے لگیں۔ انہوں نے میری بلائیں لیں۔ میرا منہ چوما۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

''اتنے دن کہاں رہے بیٹا؟'' اپنی تائی کو بھی بھول گئے؟

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ جلدی سے پھولے پھولے سانسوں میں اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں۔ ''سروج راضی خوشی ہے نا؟''

''ہاں تائی۔''

''اور وڈا کاکا؟''

''ڈاکٹری میں پڑھتا ہے۔''

''اور نکا؟''

''کالج میں پڑھتا ہے۔''

''اور شانو اور بٹو؟''

''وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ کملا کی میں نے شادی کردی ہے!''

''میں نے بھی سوتری کی شادی کردی ہے۔ پورن اب رڑکی میں پڑھتا ہے، نمی اور بنی کے ماں باپ مل گئے تھے وہ آکر ان کو چھ سال بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی چٹھی پتری آجاتی ہے۔ میرے پاس صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے چلا جائے گا۔''

یہ تائی کے ان یتیم بچوں کی داستان تھی جو انہوں نے فساد میں لے کر پالے تھے۔

میں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا۔ ''تائی وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے۔ کیسے بتاؤں۔ کتنا شرمندہ ہوں اب تک نہ بھیج سکا۔ اب دلی جاتے ہی بھیج دوں گا۔''

''کیسا قرضہ بیٹا؟'' تائی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہی گوکھرو والا۔''

''اچھا وہ؟'' .... یکا یک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

''وہ تو تیرا قرضہ تھا بیٹا۔ جو میں نے چکا دیا۔''

''میرا کیسا قرضہ تھا تائی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا۔'' تائی سنجیدہ ہو کر بولیں۔ ''اسے

چکاتے رہنا چاہیے۔تو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟نہیں، تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی،تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دنیا آگے کیسے چلے گی؟ایک دن پرلے آجائے گی.......... بیٹا اسی لیے تو کہتی ہوں۔ میں نے تیرا قرضہ چکایا ہے۔تو کسی دوسرے کا قرضہ چکا دے.......... ہر دم چکاتے رہنا ہی ہم سب کا دھرم ہے۔"

تائی اتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

میں کیا کہتا۔ روشنی سے سایہ کہہ بھی کیا سکتا ہے؟اسی لیے میں سب کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ ہو گئیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔"اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے ورنہ تیرے لیے کھانا پکاتی۔اب گوپی آئے گا تو کھانا بنائے گا۔تیرے لیے۔کھانا کھا کر جانا..........میں؟"

"نہیں تائی۔اس کی کیا ضرورت ہے۔وہاں بھی تیرا ہی دیا کھاتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔"میں یہاں تیج پال کی شادی پر آیا تھا۔اسٹیشن سے سیدھا تمہارے گھر آ رہا ہوں۔اب شادی والے گھر جاؤں گا۔"

"بلاوا تو مجھے بھی آیا ہے۔مگر دو دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔اس لیے میں نہیں جا سکتی۔شگن میں نے بھیج دیا تھا۔تم میرے طرف سے تیج پال کے سر پر پیار دینا۔"

بہت اچھا تائی.......... کہہ کر میں تائی کے چرنوں میں جھکا۔انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سو سو دعائیں دے کر بولیں۔"بیٹا میرا ایک کام کر دو گے؟"

"حکم کرو تائی؟"

"کیا کل تم صبح یہاں آ سکتے ہو؟"

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا جنم جلا اندھیرا چھایا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم صبح کسی وقت دن میں آ جاؤ تو میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کاکا!"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"آ جاؤں گا تائی۔"

دوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کے لیے اسٹیشن جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا تو میں ان لوگوں سے معذرت کر کے تائی ایسری کے گھر کی طرف ہو لیا۔ گلی کے موڑ پر مجھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ سر جھکائے ملے۔ مگر میں جلدی جلدی سے قدم بڑھتا ہوا آگے چلا گیا۔ مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ملے۔ معلوم ہوا آج صبح تائی ایسری کی موت واقع ہو گئی اور جب ہم لوگ اسٹیشن گئے ہوئے تھے وہ چل بسیں۔

اندر کمرے میں ان کی لاش پڑی تھی۔ ایک سفید چادر میں ملبوس، چہرہ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔ کمرے میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی اور پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا۔

تائی ایسری کی آنکھیں بند تھیں اور ان کا معصوم بھورا بھورا چہرہ پر سکون،

خاموش اور گہرے خوابوں میں کھویا ہوا ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ تائی ایسری کا چہرہ نہ ہو دھرتی کا پھیلا ہوا لا متناہی چہرہ ہو جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں۔ جس کے ہر شکن میں لاکھوں وادیاں انسانی بستیوں کو اپنی آغوش میں لیے مسکراتی ہیں۔ جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھوٹتی ہے۔ جس کی معصومیت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ جس کے دل میں دوسروں کے لیے بے پناہ مامتا جاگتی ہے۔ جس کا مزہ کوئی کوکھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے!

میں ان کے پاؤں کے قریب کھڑا ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے بائیس تیئس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی روئی ہیں اور ابھی پھر رو دیں گی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں گوپی ناتھ ہوں۔''

میں سمجھ گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں، کیا نہ کہوں۔

''میں تیج پال کے گھر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ مگر آپ اسٹیشن پر گئے ہوئے تھے۔'' وہ پھر بولا۔

میں پھر بھی چپ رہا۔

گوپی ناتھ دھیرے سے بولا۔ ''صبح تائی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس لیے وہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب انہیں یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت قریب آن پہنچا ہے اور آپ نہیں آئیں گے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔''

”جب میرا بیٹا رادھا کشن آئے تو اسے یہ دے دینا!“

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دی!

مجھے معلوم نہیں ہے آج تائی ایسری کہاں ہیں؟ لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں تو وہ اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین پیڑھی پر بیٹھی، اپنی پچھی سامنے کھول کر، بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی!

اختتام ـــــــــــــــــــــــ حصہ دوئم

Iqbal Cyber Library.Net
All rights reserved
©2002-2006

p0324.html